جھیل ڈل کی کہانی اپنی زبانی

پیاسی جھیل

(افسانوں کا مجموعہ)

مجید ارجمند

MEEZAN

جھیل کی کہانی اپنی زبانی اور افسانے

پیاسی جھیل

مجید ارجمندؔ

نام کتاب: پیاسی جھیل

ناشر: مجید ارجمند

سال اشاعت: جولائی 2018ء

قیمت: -/300

تعداد: 500

گھر کا پتہ

۱۹۰۔ بچھوارہ ڈلگیٹ سرینگر کشمیر

فون: 2477346

موبائل: 8082123818

انتساب

اپنی مرحومہ بیگم نورالنساء کی نذر

جو خود بھی مُصنفہ تھی......



فہرست



مجیدار جمندؔ کی افسانہ نگاری

مجیدار جمندؔ سے میری جانکاری ایک عرصہ پر محیط ہے۔ میں انہیں ایک عرصہ سے پڑھتا آرہا ہوں...... مختلف اخبارات ورسائل میں ان کے افسانے اکثر چھپتے رہتے ہیں...... اس سے قبل بھی ان کا ایک افسانوی مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے۔

کشمیر میں منعقد ہونے والی اکثر ادبی نشستوں میں ان کی شرکت رہتی ہے...... اور رسائل وجرائد میں چھپتے رہتے ہیں اس لیے لازماً ان کے افسانے نظر سے گزرتے رہتے ہیں، جہاں تک ان کے افسانوں اور ان کے موضوع کا تعلق ہے یہ روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات پر قلم اٹھاتے ہیں۔ صاف گوئی سے کام لے کر سیدھی اور واضح بات کرتے ہیں اُن کی زبان عام فہم زبان ہوتی ہے۔ جو ہر پڑھنے والے کی سمجھ میں آتی ہے......

مجھے امید ہے کہ مجیدار جمندؔ کا یہ افسانوی مجموعہ بھی شوق سے پڑھا جائے گا......

نور شاہ



مجید ارجمند کا دوسرا افسانوی مجموعہ

مجید ارجمند کا یہ دوسرا افسانوی مجموعہ میرے ہاتھوں میں ہے۔اس میں کئی افسانے شامل ہیں...... مجید ارجمند بہت دنوں سے افسانے لکھ رہے ہیں......ان کے لگ بھگ تمام افسانے معاشرے سے جڑے انسانی مسائل ومعلومات سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں...... یہ اس سے باہر نہیں نکلتے......ظاہر بات ہے ایک افسانہ نگار بھی اسی انسانی معاشرے کا جز ایک اکائی ہوتا ہے......وہ جو کچھ دیکھتا ہے، جن حالات سے اسے خود بھی کسی نہ کسی صورت میں گزرنا پڑتا ہے۔ان ہی حالات کا عکس اس کی تخلیقات میں نظر آتا ہے......

مجید ارجمند کے اس دوسرے افسانوی مجموعے میں بھی یہی سب کچھ ہے خواہ وہ ''پہاڑی لڑکی''، ''ننھی کلی''، ''اونچی اڑان''، ''فرشتے''، ''آندھی اور چراغ'' افسانے ہوں یا پھر ''بے نور آنکھیں'' وغیرہ ہر افسانہ کا تعلق ایک عام شخص کے ساتھ پیش آنے والے واقعات سے ہے۔اوران افسانوں کے کردار بھی ہمارے پاس پڑوس میں ہمارے دائیں بائیں اور آگے پیچھے چلنے والے کردار ہی ہیں اور کوئی نہیں۔

امید کرتا ہوں کہ مجید ارجمند کا یہ مختصر سا افسانوی مجموعہ ادبی حلقوں

میں نہ صرف پسند کیا جائے گا بلکہ اس کی خوب پذیرائی بھی ہوگی۔

خیر ایک سال قبل مجید ارجمند کی اہلیہ محترمہ نور النساء کا انتقال ہو گیا اس سانحہ نے انہیں نڈھال کر دیا......اور یہ اس میں کافی دیر تک رہے افسانہ نگاری میں خود کو مشغول رکھنا کچھ حد تک ان کے اس بڑے اور صبر آزما سانحے کا کسی حد تک مداوا بھی ہے۔ انہیں اپنے اس دیرینہ مشغلے کو جاری رکھنا چاہیے۔ خاص طور پر ان کی مرحومہ اہلیہ نور النساء کے لیے جو خود بھی ایک اچھی دوست ادیبہ تھی۔

ڈاکٹر اشرف آثاری



افسانوی مجموعہ ''پیاسی جھیل''

افسانہ نگار مجیدار جمندؔ

'پیاسی جھیل' افسانوں کے مجموعہ میں مصنف 'مجیدار جمندؔ' کے ہوشیار مغز، صاحب طرز اور صحیح اسلوب و بیان میں لکھنے والے قلم کار ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ 'پہاڑی لڑکی' افسانہ کے ابتدائی پیرایہ میں یہ جملہ کیا خوب لگتا ہے کہ 'کوئی لڑکی آ کر مجھ سے ملے اس انتظار میں شام سے رات ہوگئی' اور پھر اس تناظر میں یہ جملہ کہ 'تب مجھے پہاڑ پر بسا ہوا اپنا گاؤں یاد آنے لگا......' مطلب یہ کہ مجیدار جمندؔ کو اجنبیت سے مانوسیت اور مانوسیت میں سے حیرت میں اپنے پلاٹ کو ایک ہی کردار کی زبان میں بیان کر دینے کا خوب مِلکہ حاصل ہے۔ منظر کشی میں تضادات کو نبھانا دیکھنا ہو تو یہ جملے کس قدر سکون بخش اور رہنما جیسی صورت احوال پیش کر دیتے ہیں جیسے ''یہ شہر تو روشنیوں کا شہر ہے......لیکن میرا وہ پہاڑی علاقہ بھی اس سے کچھ کم نہیں......اور یہ کہ دیہات کی انگریزن...... پہاڑی لڑکی واہ!......کیا جوانی ہے......'' یہ رہا شہر کے جنید جیسے اوباش یونیورسٹی لڑکے کا بیان اور پھر 'میں اسے لینے آئی ہوں......اسے یونیورسٹی سے نہیں نکالا جائے گا......'' یہ رہا پہاڑ کی بھولی

بھالی یونیورسٹی لڑکی کا بیان ...... یہ ہے جذبات اور احساسات کا پورا پورا پاس ولحاظ رکھنا جو کسی بھی افسانہ نگار کو پرکھنے کا ایک معیار قائم کردیتا ہے۔ آگے چل کر 'پہاڑی لڑکی' کا اس قسم کا برملا اظہار کہ...... دراصل بات...... بات یہ...... یہ ہے کہ میں شادی شدہ ہوں میری شادی کم سنی میں کردی گئی تھی...... کسی ایک سماج کے اس منظر کی بھرپور عکاسی کردینے کے لیے کافی ہے۔ یوں کہئے کہ مجیدار جمند صاحب اپنے پہلے ہی افسانے میں کامیاب اور کامران نظر آتے ہیں۔

کوئی بھی قلم کار خود بہ ذات بااعتماد اور صحت مند سوچ کا حامل نہ ہو وہ کسی بھی کہانی کے پلاٹ کو سچ مچ دریافت اور بازیافت نہیں کرسکتا ہے۔ یہ بات مجیدار جمند صاحب کے افسانہ ننھی کلی کے پڑھنے سے خوب سمجھ میں آتا ہے۔ بات اگر لڑکیوں کے ان پڑھ رہنے کی ہوتی ہے تو اس کا الزام عام طور پر لڑکیوں کی ماں کے سر پر تھوپا جاتا ہے لیکن صاحب موصوف افسانہ نگار ہمیں پتہ دیتے ہیں کہ اس کا قصور ان کے باپ کا ہوا کرتا ہے جو اپنی بیویوں کو باہری کارکردگی کے دباؤ میں رکھ کر اُن کے اصل احساسات وجذبات پر شب خون مارتے ہیں اور لڑکیوں کی ترقی میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ اسس افسانے میں کرداروں کے مناسب حال نام چُن لینا واقعی ایک قابل تحسین قلم کاری ہے جیسے زونی، زیتون، عائشہ، ریحانہ قابل لحاظ، معنی خیز اور حسب حال کردار دکھائی دیتے ہیں۔ دراصل تعلیم میں بچھڑاپن دیکھنا ہو تو آج کے

انگریزی اور عربی ناموں کے برعکس انہی نچلے طبقوں کے دیہاتی ناموں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس بات کو کوئی سماجیاتی نفسایت دان ہی سمجھ سکتا ہے۔ ایک ہی معنی اور مطلب کے الفاظ کو مختلف پیرایوں میں استعمال کرنا در خوراعتناءنہیں سمجھ لینا چاہیے جیسے ایک جگہ معلمہ بہت ہی خوبصورت اردو لفظ اور اسی معنہ میں دوسری جگہ عورت ٹیچر اردو انگریزی زبان میں برتنا کیا خوب سجتا ہے۔ بڑے خیالات کو ایک چھوٹے منہ سے بیان کرنا بھی کچھ کم نہیں جیسے حکومت نے محکمہ تعلیم کی جانب سے اشتہاری تحریک چلائی تھی، صاحب موصوف کے ذہنی اُفق اور شعور وآگہی کی جدت طرازی کا پتہ دینے کے لیے ایک بہترین مثال ثابت ہوسکتی ہے۔ اس افسانے میں کسی مسئلہ کے کئی پہلو کسی قاری کے سامنے خواب وخیال کے بجائے حقیقی صورت احوال میں پیش کرنا اور پھر اس مسئلہ کے خود بہ خود حل نکلنا یا کہ نکلوانا کردار نگاری میں پختہ کاری کے ثبوت پیش کردیتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی ارجمند صاحب قابل ذکر اور قابل داد ہیں۔ یہاں پر یہ بات عیاں ہے کہ صاحب موصوف افسانہ نگار کو پلاٹ کے کلائمیکس کو اُجاگر کردینے کی طرف بدستور فکر دامن گیر دکھائی دیتی ہے بلکہ وہ ایک کیا کئی سارے کلائمیکس پیدا کرنے اور دکھا دینے کے اہل ہیں۔ اس قسم کی فنی چابکدستی پر نوجوان افسانہ نگار کو میری طرف سے بہت سارے مبارک بادی کے الفاظ چاہیں۔

'اونچی اڑان' جیسا افسانہ پتہ دیتا ہے کہ افسانہ نگار مجید ارجمند

صاحب 'پھیکی دکان' کو ایک قسم کے تناقص یعنی Contrast کی صورت میں پیش کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ شہر کی عالی شان کوٹھیوں میں درد سے کراہ رہا دیہاتی سرمایہ دار کیا کچھ کھو دیتا ہے ایسا کچھ اس افسانے میں خوب نظر آتا ہے۔ وہ تو شہر میں بالضرور ڈاکٹر صاحب کو بڑے اسپتال کے سجے سجائے بیڈ کے آس پاس دیکھ پاتا ہے لیکن اپنے گاؤں کے عبدالرحیم چاچا کو اپنے کھیت کے آس پاس کھو دیتا ہے۔ اس قسم کے تقابلی مشاہدے کو اپنے مخصوص قسم کے کشمیری یعنی نجی پس منظر سے حاصل کر کے دوسری زبان یعنی اردو کی جیتی جاگتی زبان میں قاری کی نظروں میں آمنے سامنے لانا زبان دانی پر محمول نہ کیا جائے تو اور کیا۔

مجید صاحب کا فرشتے والا افسانہ ہمیں پتہ دیتا ہے صاحب موصوف ایک سچا سماجیاتی محقق ہے وہ سو پردوں میں چھپے ہوئے رازوں کو چٹکی بھر میں معلوم کر سکتا ہے اور کمال یہ ہے کہ دوسروں یعنی غیروں کے کثیف ماحول میں۔ ایک بے اولاد ماں کا اجمیر شریف اس غرض سے جانا کہ اُسے عقیدے کے حساب سے شادی کے آٹھ سال بعد اولاد مل جائے اور پھر اس کوشش میں اُس کا خاوند کسی غیر عورت سے کسی دوسری عورت کی گود سے چرا لی گئی بچی کو چند روپیوں کے عوض خرید کر اپنی بیوی کے ہاتھوں میں دے دینا۔ اُس کی بیوی کا پولیس والوں سے تلاش و تفتیش سے بچ بچا کر اس نئی خریدی گئی انسانی گڈیا کو پھر سے پولیس اسٹیشن جا کر اپنی اصل ماں کو پھر سے لوٹا دینا

اخلاقیات کے اعلیٰ معیار کو اپنے افسانوی رنگ و آہنگ میں پیش کرنا ایک اصل قلم کار کا ہی کمال ہوسکتا ہے۔ اس ضمن میں ارجمند صاحب کو صد ہزار شاباشیاں نصیب ہوں!

کسی کہانی کو لکھ کر اس سے مارل نکال دینا واقعی قابل پرکھ بات ہے اس سلسلے میں بھی صاحب موصوف باکمال اور باہوش نظر آتے ہیں اس ضمن میں افسانہ 'آندھی اور چراغ' قابل ذکر ہے۔ افسانے کے عنوان کو موضوع اور تخلیقی حیثیت سے دیکھنا ہو تو 'بے نور آنکھیں' کیا خوب پیغام دیتا ہے اور کہانی کی اصل زمین تک پہنچا دیتا ہے۔ افسانہ 'بے نور آنکھیں' میں جس طرح کسی حالیہ واقعہ کو کسی تاریخی واقعہ کی مانند پیش کیا گیا ہے اس میں کسی نامہ نگار یا جرنلسٹ کا پورے کا پورا چھان بین اور واقعہ نگاری ہماری نظروں کے آمنے سامنے آتا ہے ایسا کچھ ہونا بھی تو ایک قلم کار بالخصوص افسانہ نگار کے لیے بہت ہی ضروری ہے کیونکہ معلومات اور مضمون آفرینی سے بڑھ کر واقعہ نگاری پر دسترس ہونا کسی بھی قلم کار کے لیے ازبس لازمی اور لابدی ہے۔

افسانہ ''پیاسی جھیل'' کا پورے افانون مجموعہ میں نرالی شان بخشا سچ مچ قابل لحاظ فعل ہے۔ اپنی جسامت اور مواد کے حوالے سے تو یہ افسانہ دوسرے افسانوں کی بہ نسبت بڑا اور وسیع ہے لیکن استعارات، تلمیحات، تشبیہات اور مثالوں سے مالامال دکھائی دیتا ہے۔ اس افسانے

کی خاص بات یہ ہے کہ ایک قدرتی مگر بظاہر بے جان و بے روح Phenomenon یعنی ظاہر میں موضوعی اعتبار سے صاحب موصوف افسانہ نگار نے ایک جان اور روح پھونک کر بہ باطن کسی زندہ جاوید صورت یعنی عورت کے معنی و مفاہیم جیسے پہنا رکھے ہیں۔ لیکن اگر ہم اس عنوان کو 'پیاسی جھیل' کے بجائے 'پیاسی عورت' بھی سمجھ لیں تو بھی بات اور زیادہ بڑی دکھائی دے گی اور اس کا پلاٹ یعنی نفس مضمون ہاتھ آئے گا حالانکہ ایک ہی کردار کے ارد گرد کئی سارے ذیلی کردار رقص کرتے ہوئے محسوس ہوئے ہوں گے۔ ایسا کچھ کسی قلم کار میں ضرور دیکھنا پرکھنا چاہیے۔

افسانہ 'بلا عنوان' واقعی طور پر اردو محاوروں میں کشمیری حالات و واقعات کی ایک جیتی جاگتی عکاسی کی بہترین نمائندگی دکھائی دیتی ہے۔ در اصل زبان و زبان کی ترسیل میں ایسا کچھ دکھائی دینا بھی ضروری ہے۔ اس افسانے میں بہت سارے سماجیاتی اور نفسیاتی نکات کی نشاندہی ہوتی ہے۔

بہر حال یہ افسانوی مجموعہ مجیدار جمند کو ارجمند بنا سکے گا کیونکہ جتنے بھی افسانے انہوں نے لکھے ہیں وہ روایت کے پلکوں کو چھو کر ایک الگ عمارت بنانے کی ایک زبردست کوشش ہے۔

علی احسن

محکمہ تعلیم جموں و کشمیر

"پیاسی جھیل"

اور

مجید ارجمندؔ

'پیاسی جھیل' نام ہی، ذہن کو اس طرف منتقل کرتا ہے کہ جھیل کے کنارے رہنے والا کوئی شخص، جھیل کی کسمپرسی اور اس کے کرب کا احساس رکھتا ہے۔ ظاہری طور تو یہ لگے گا کہ جھیل کا نظارہ کرنے والا پیاسا ہو سکتا ہے لیکن مجید ارجمندؔ نے جھیل کی نبض پر ہاتھ رکھ کے، اس کی لہروں کے تلاطم سے، اس کے سینے پر جمی کائی سے اندازہ کرلیا ہے کہ یہ جھیل چشم کرم، محبانہ توجہ، مہرباں ہاتھوں، مشفقانہ برتاؤ اور جمال پرست نگاہوں کی توجہ کی پیاسی ہے۔

اللہ نے اس جھیل کے کنارے رہنے والوں کو دو طبقوں میں بانٹا ہے۔ ایک وہ جو اسے دیکھ کے جیتا ہے اور دوسرا طبقہ وہ جو اسے تڑپا تڑپا کے مارتا ہے۔

شکر ہے کہ ہمارے مجید ارجمندؔ کا تعلق اول الذکر سے ہے۔ گو کہ کہانیاں ہمیں مختلف کرداروں سے ملاتی ہیں، کئی طرح کے واقعات کا نظارہ

کراتی ہیں، گونا گوں مسائل سے دوچار ہونے والے انسانوں سے ملاقی ہیں مگر کہانی پیاسی جھیل اور اس مجموعے کا عنوان ہمیں ایک ایسی کہانی سے روشناس کراتا ہے، جسے ابھی لکھنا باقی ہے۔

میری دعا ہے کہ یہ مجموعہ بھی مجیدارجمندؔ کے پرانے مجموعوں کی طرح سے مقبول ہو۔

پروفیسر محمد زماں آزردہؔ

حسن آباد رعناواری۔ سری نگر

۵۔نومبر ۲۰۱۷ء



پہاڑی لڑکی

وہ میری زندگی کا ایک نیا اور خوبصورت دن تھا۔ جب مجھے یونیورسٹی میں داخلہ ملا...... امیدوں اور ارمانوں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر میں پہاڑی اپنے گاؤں سے نکل کر شہر آ گئی تھی۔ اور یونیورسٹی کے ہوسٹل میں قیام پذیر ہو گئی تھی...... اس دن میں بالکل انجان اور اکیلا پن محسوس کر رہی تھی...... بہت دنوں تک لڑکیوں سے میل جول نہیں ہوا تھا...... میں تو یہی سمجھ رہی تھی کہ سبھی لڑکیوں کا ایڈمشن کے دوران دوڑ دھوپ میں ہی وقت گزر رہا تھا...... اس لیے کسی سے بات چیت کا موقعہ ہی نہ ملا...... لیکن بات کچھ اور ہی تھی...... کوئی لڑکی آ کر مجھ سے ملے اس انتظار میں شام سے رات ہو گئی، لیکن میرے ہوسٹل کے کمرے میں آ کر کوئی بھی لڑکی مجھ سے نہیں ملی...... ایسا لگتا ہے کہ وہ لوگ گاؤں کی لڑکی کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے ہیں۔ تب مجھے پہاڑ پر بسا ہوا اپنا گاؤں یاد آنے لگا......

میں تو اپنے ہی گاؤں میں خوش تھی...... ماں باپ بھائی بہنوں سے مجھے ہمیشہ ہی بہت پیار ملا تھا...... ماں کا پیار تو دنیا کے رشتے سے زیادہ نہیں...... اور پھر سب کو یکسر چھوڑ کر یہاں آ گئی۔

یہ بنگلور تو روشنیوں کا شہر ہے۔ خوبصورت دلکش اونچی اونچی عمارتیں،

لمبی لمبی سڑکوں کا جال، رونقوں کا بازار ہے...... یہاں یہ سب اپنی جگہ پر کشش، لیکن میرا وہ پہاڑی علاقہ بھی اس سے کچھ کم نہیں......اس لیے مجھے وہ سب یاد آنے لگا ہے...... یہ تو انسان کا بنایا ہوا شہر ہے......لیکن میری وادی تو قدرت نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔ دل کو چھونے والے قدرتی نظارے۔ وہ سفید برفیلے پہاڑ......روح پرور فضائیں، سرسبز شاداب کھیت آبشار دونوں کا اگر موازنہ کریں تو......؟ شاید یہ مناسب نہیں......

پتہ نہیں ایسی باتیں کیوں سوچ رہی ہوں...... میں تو صرف پڑھائی کرنے آئی ہوں......اپنی زندگی سنوارنے کے لیے پھر یہ ذہنی الجھن کیوں......؟ اصل میں تنہائی میں اسی طرح کی باتیں سوجھتی ہیں......

میں کروٹیں بدل بدل کر سونے کی کوشش کر رہی تھی......کوئی ساتھی ہوتا تو باتوں باتوں میں نیند آجاتی......لیکن کچھ ہی دیر میں نیند آہی گئی۔

صبح مرغ بانگ سے نیند کھلی...... یہ بانگ تو گھر میں ہمارا مرغ دیتا تھا...... یہاں کیسے آیا مجھے جگانے کے لیے......کیا میں واقعی جاگ گئی تھی...... یا خواب دیکھ رہی تھی......

نہادھو کے میں کنٹین چلی گئی......وہاں لڑکوں اور لڑکیوں کا ہجوم تھا...... کوئی بھی ٹیبل خالی نظر نہیں آرہی تھی میں کچھ دیر خاموش کھڑی رہی، کسی نے میری طرف دھیان نہیں دیا......ایک بار میں نے لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرانا چاہا......لیکن انہوں نے ٹال دیا......سب کھانے پینے یا باتوں میں مشغول

تھے...... یہاں شہر میں کون کس کی پرواہ کرتا ہے......لیکن پھر ایک لڑکا کرسی سے اٹھ کھڑا ہو گیا۔ اور مجھے کرسی پر بیٹھنے کے لیے آفر کیا...... میں نے لڑکے کو غور سے دیکھا...... وہ جنید تھا...... جس نے مجھے ایڈمشن کے وقت یونیورسٹی کے احاطے میں خاصا پریشان کیا تھا۔ اور بے ہودہ طریقے سے فقرے کسنے لگا تھا...... اس کے بولے ہوئے بے ہودہ مکالمے اب تک مجھے یاد تھے......

''ہٹو...... ہٹو، ہٹو گاؤں والی آرہی ہے...... دیہات کی انگریزن...... سیدھے پہاڑ سے آئی ہے...... پہاڑی لڑکی واہ...... کیا جوانی ہے......''

اس وقت میں شرم وحیاء سے دوہری ہوئی جارہی تھی۔ اور وہ جنونی انداز میں سب کچھ بولے جارہا تھا...... میرے جذبات کی پرواہ کئے بغیر...... میں تو خاموش بت سی کھڑی تھی......

اور اب وہی جنید بڑے ادب کے ساتھ مجھے کرسی پیش کررہا تھا۔ میں نے اس کی بات مانی اور کرسی پر بیٹھ گئی......شاید وہ اپنے کئے پر شرمندہ تھا...... میرے لیے یہ کافی تھا۔

دوران تعلیم کسی رنجش کو بڑھاوا دینا اچھی بات نہیں...... میں نے اپنی سوچوں کے سارے رخ موڑ دیے تھے......اب تو سب کچھ بھول چکی تھی......

وقت تیزی سے گزررہا تھا...... پڑھائی کے ساتھ ساتھ اب میں بھی کھیل کود، رقص و نغمے یعنی یونیورسٹی کی ہر تفریح میں اپنے آپ کو مشغول

کرنے لگی تھی ......لیکن ساتھ ہی مجھے نفسیاتی الجھن نے بھی گھیر رکھا تھا......
اور تنہائی میں سوچتی تھی کہ کیا میں یہاں کی لڑکیوں سے کچھ مختلف ہوں۔
اور کیا اب بھی ایک پہاڑی لگتی ہوں......کیا میرے پہنے ہوئے کپڑے ان
کے کپڑوں سے میل نہیں کھاتے ہیں......یا پھر بولنے کا طریقہ ان سے الگ
ہے......

یہاں کی لڑکیوں کو کھل کِھلانے اور قہقہے لگانے کی عادت سی تھی......
کبھی کبھی میرا بھی دل ہنسنے اور کھل کھلانے کو چاہتا تھا لیکن وہ مجھ سے نہیں ہوتا
تھا...... کیونکہ میں چھوئی موئی سی تھی......اور اپنے آپ میں کھوئی ہوئی
......شہر کا رنگ مجھ پر چڑھ نہیں رہا تھا......میرے دماغ پر ہر وقت لڑکیوں کی
بے رخی کا اثر تھا......اور میرا دیہاتی الڑپن جا نہیں رہا تھا......کبھی کبھی ذہن
کی ایسی حالت زندگی کی نفی بن جاتی ہے۔

میں خود ان سب سے ملنے جلنے کی کوشش نہیں کرتی ہوں......اور
یہی وجہ ہے کہ میں ان سے الگ تھلگ ہوں اور شہر کا میل جول بڑا مشکل
ہوتا ہے......لیکن کوشش کر کے جب میں نے ان سب سے میل جول بڑھانا
شروع کیا تو جنید میرے ساتھ بے تکلفی سے پیش آنے لگا......وہ مجھ سے
دوستی کرنا چاہتا تھا......

ایک دن یونیورسٹی کے فنکشن میں مجھے گانے کے لیے بلایا گیا۔وجہ
یہ تھی کہ ہوسٹل میں ایک بار کچھ لڑکیوں کے ساتھ کشمیر کا ایک لوک گیت گا چکی

تھی...... جسے لڑکیوں نے بہت پسند کیا تھا......شاید وائس چانسلر کو کسی نے میرے گانے کے بارے میں بتا دیا تھا......تب مجھے خیال آیا......یہی وہ موقع ہے جس کے ذریعے میں یونیورسٹی میں اپنی پہچان بنا سکتی ہوں......

میں نے کھچا کھچ بھرے ہال میں گانا گایا اور خوب دل سے گایا......

کشمیری لباس میں ملبوس میں نے ایک خوبصورت لوک گیت گایا......اور سب کا دل جیت لیا......اپنی جانب سب کو راغب دیکھ کر میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک آئے......اس کے بعد بہت سے لڑکے اور لڑکیاں میری جانب آئے اور مجھے مبارکباد دینے لگے......جنید ان میں سب سے پیش پیش تھا۔

ایک پہاڑی لڑکی اب ان کے لیے اجنبی نہیں رہی تھی۔ وہ جنید تو میرے کچھ زیادہ قریب آنے لگا تھا......اور یہ کیا غضب ہوا کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگا۔ لیکن اس کی محبت مجھے قطعی قبول نہیں تھی......میں تو ایک سیدھی سادی لڑکی صرف تعلیم حاصل کرنے آئی تھی...... عشق و محبت میں گرفتار ہونے نہیں......کیا کسی لڑکی کا خوبصورت ہونا گناہ ہے......صرف خوبصورتی دیکھ کر اس سے عشق کیوں کرنے لگتے ہیں......اور اسے عام زندگی کیوں نہیں جینے دیتے؟

"میں تم سے محبت کرتا ہوں......تم اتنی حسین اور خوبصورت ہو کہ تمہارے بغیر میں جی نہیں سکتا ہوں۔"

جنید نے بالآخر اظہارِ عشق کر ہی دیا...... میں گھبرا گئی...... اور سنی ان سنی کر کے آگے بڑھ گئی...... تعلیم کے دوران عشق و محبت کی باتیں کر کے جنید خود اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہا تھا......

مجھے اس بات کا بھی احساس ہوا کہ...... عشق و محبت سے دور رہ کر میں اپنی اور اس کی زندگی بچا سکتی تھی......

وہ ایک متوسط گھرانے سے تھا...... اگر خدانخواستہ پڑھائی نہ کرے گا تو برباد ہو جائے گا...... اس لیے میں نے دل کڑا کر ایک فیصلہ کیا اور وائس چانسلر سے اس کی شکایت کر دی......

میری شکایت کوئی معمولی نہیں تھی کہ جنید کو زیادہ پچھتاوا نہ ہو...... میں نے کہا جنید نے میری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی...... وائس چانسلر سخت قسم کے آدمی تھے...... میری شکایت پر انہوں نے جنید کو یونیورسٹی سے نکالنے کا نوٹس دے دیا...... جنید نے نوٹس کا جواب نہیں دیا...... ایک دم سے غائب ہو گیا......

کئی دن گزر گئے...... لیکن وہ نہیں آیا...... وہ کہاں چلا گیا تھا۔ یہ کسی کو پتہ نہیں تھا...... اور تب میں اپنے آپ کو قصوروار سمجھنے لگی تھی...... کہ میں نے اس کی زندگی برباد کی......

میں تو اچھا کرنا چاہا تھا...... لیکن ہو رہا تھا برا اب میں کیا کروں...... میں سوچنے لگی...... مجھے معلوم نہیں تھا اس طرح جنید چلا جائے گا یونیورسٹی

چھوڑ کر اس مسئلے کا حل آتے ہی میں وائس چانسلر کے پاس گئی......اور اُن سے کہا میری وجہ سے جنید کی زندگی برباد ہو رہی ہے......اسے معاف کردیں۔ اور ایک موقعہ دیں......وہ شاید اچھے گھرانے کا ہے......پھر شاید ایسی حرکت نہیں کرے گا......

وائس چانسلر اچھے دل کے مالک تھے۔ انہوں نے کہا گر وہ تحریری معافی مانگے اور آئندہ نیک چلن بنے رہنے کا وعدہ کرے تو معافی دی جاسکتی ہے......

امتحان قریب تھے......اگر وہ جلدی نہ آیا۔ تو اس کا سال ضائع ہوجائے گا......اُسے ڈھونڈنا ضروری تھا......اور یہ کام میری جیسی لڑکی کے لیے بہت مشکل تھا......جو شہر سے ٹھیک طرح واقف بھی نہ تھی۔

اسی الجھن اور پریشانی میں ڈوبے ہوئے میں نے بہت دن اسی سوچ میں گزارے......اچانک دل میں ایک امید سی جاگ اٹھی......میری کلاس کی ایک اسٹوڈنٹ نے میری رہبری کی......اس کا پتہ لے کر اس کے گھر گئی......آخر جنید کے گھر تک پہنچ گئی تھی......

صبح کا وقت تھا......تھوڑی سردی تھی......جنید اور اس کی ماں کو سلام کیا۔ اور اپنا نام بتادیا اور اپنے بارے میں بھی بتایا۔

"اچھا تو وہ تم ہو جس نے میرے بیٹے کو سماج میں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا......اور جس کی وجہ سے اسے یونیورسٹی سے نکالا جارہا

تھا۔......''

آنٹی وہ باتیں سب جانے دیں......میں جنید کا نقصان نہیں ہونے دینا چاہتی......میں اسے لینے آئی ہوں......اسے یونیورسٹی سے نہیں نکالا جائے گا......

''یعنی تم اپنا الزام واپس لے رہی ہو''......جنید نے پوچھا......''

وائس چانسلر تمہیں معاف کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ میرے ہی کہنے پر۔

میں نے کیا ہی کیا تھا......کب میں نے تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی......میں ایسا سوچ بھی کیسے سکتا ہوں ایسی حرکت میں کروں اور وہ بھی ایک سٹوڈنٹ کے ساتھ۔

ہاں، ہاں، میں نے تم سے محبت کی ہے......آج بھی کر رہا ہوں......اس کی سزا دینا چاہتی ہو تو دے دو......

میں تمہاری خاطر یونیورسٹی چھوڑ بھی سکتا ہوں......فی الحال اپنی پڑھائی بھی......

دیکھو جنید یہ محبت والی بات کہہ کر تم نے بہت بڑی غلطی کی......یہ تمہاری ماں بھی تمہاری بے ہودہ باتوں سے شرمندہ ہو رہی ہے......ماں کے سامنے ایسی باتیں کرنا ایک سٹوڈنٹ کو زیب نہیں دیتا۔ دیکھ رہے ہو میرا بھی شرم سے سر جھک گیا ماں کے سامنے......جو تمہیں دکھائی نہیں دے رہا ہے

شاید......

خیر! تم نے نادانی اور ناسمجھی میں بات کی ہے۔ اس لیے میں تمہیں معاف کر دوں گی......

میری ذات سے جڑی ایک بات ہے......اس کا پتہ تمہیں نہیں ہے......دراصل بات......بات یہ......یہ ہے کہ میں شادی شدہ ہوں میری شادی کم سنی میں کر دی گئی تھی...... پہاڑوں کی بستیوں میں رہنے والے لوگوں میں یہی رواج ہے...... میں نے آگے پڑھنا چاہا تھا اس لیے میری رخصتی مزید کچھ عرصے کے لیے روک دی گئی تھی۔

میرے اس انکشاف پر دونوں ماں بیٹا ہکا بکا رہ گئے..........



ننھی کلی

صبح کی ٹھنڈی اور خوشبودار ہواؤں نے مجھے نیند سے جگا دیا...... زندگی کی ایک فاتح سی مسکراہٹ جواب تک کھوئی کھوئی سی رہتی تھی...... ہونٹوں پر ابھر کر آنے لگی تھی ایک نئی زندگی کا آغاز شروع ہونے والا تھا...... بحثیتِ ایک معلّمہ سرکاری عہدے کا درجہ مل گیا تھا...... محکمہ تعلیم نے ٹیچر کی نوکری دے دی...... گھر والوں کے ہوتے ہوئے زندگی مطمئن نظر آنے لگی تھی......

نظریں اب بھی سرکاری کاغذوں پر مرکوز تھیں ایک ایک لفظ پڑھنے کی خواہش ظاہر کر رہی تھی...... کہ ایک مبہم سا خوف ذہن میں اتر گیا ہے...... اپنے گھر اور شہر سے دور دراز دیہات میں پوسٹنگ کی آگاہی سے متعلق آرڈر تھا...... آنکھیں لفظ لفظ پر جمی تھیں۔

دیہی علاقوں میں شہر کی لڑکیوں یا خواتین کے لیے خطرات اور تکالیف کے بارے میں کہیں کچھ کچھ آشنائی تھی...... میرا من کہہ رہا تھا کہ مجھے آنے والے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے...... اس لیے حالات کتنے بھی مخالف کیوں نہ ہوں...... مجھے آگے بڑھنا تھا......

آج کے وقت میں عورت کا بہادر ہونا بہت ضروری ہے۔ اور

خدا مقابلہ کرنے والوں کی مدد کرتا ہے......

لہٰذا میں آفتاب طلوع ہوتے ہی چاچا کے ساتھ نئے سفر پر روانہ ہوگئی......اگرچہ میرے دماغ میں بے شمار وسوسے تھے...... چاچا نے اس سفر میں میری ہمت جتائی......ہم بس میں ایک گاؤں چھوڑ کر دوسرے گاؤں اور پھر تیسرے گاؤں ......اسی طرح بس میں بیٹھ کر کئی گاؤں نظروں سے اوجھل ہوگئے۔آگے پہاڑی راستہ تھا......بس آدھے سفر پر ہی رک گئی۔ اب پیدل ہی منزل مقصود کے لیے روانہ ہونا پڑا۔سفر کی شروعات تو اچھی تھی......لیکن آگے کے سفر سے دل ڈر رہا تھا......کیا پتہ آگے کیا ہو اور لوگ کیسے ہوں......

وہ گاؤں شاید آدھا کلومیٹر دور تھا۔جہاں ہمیں پہنچنا تھا......رستے میں بہت ساری جھاڑیاں تھیں زمین ڈھلوان ہونے کے باعث پاؤں پھسل رہے تھے۔اگرچہ موسم گرم تھا......قریب پہاڑی ہونے کی وجہ سے ماحول میں خنکی تھی۔اس وجہ سے ہم سویٹر پہنے ہوئے تھے......اور پھر نئی نوکری کا جوش تھا لیکن ساتھ ہی میرے دماغ میں بس یہی وسوسہ تھا کہ گاؤں کے لوگ نہ جانے میرے ساتھ کیسا برتاؤ کریں گے لیکن سننے میں آیا تھا اکثر گاؤں کے لوگ بہت سیدھے سادے اور محنتی ہوتے ہیں۔دن بھر کام کاج میں ہی وقت گزارتے ہیں......مرد اور عورتیں ایک ساتھ کام میں جٹ جاتے ہیں۔

بہر حال ہم گاؤں پہنچ گئے......میں حیرت زدہ ہوگئی جب میں نے چاچا کو ایک دیہاتی سے بغل گیر ہوتے دیکھا......وہ ہمیں اپن گھر لے گیا۔ وہ چاچا کا جانا پہچانا رحیم جو تھا......ان کی بیگم زونی نے ہم لوگوں کا بہت خیال رکھا......ہمیں کھلایا پلایا اور سونے کے لیے گرم بستر دیا......صبح تک پتہ نہیں چلا کب آنکھیں کھل گئیں دراصل ہم سفر سے بہت تھک چکے تھے......اس طرح ہم نے رات رحیم جو کے ہاں گزار دی......

دیکھا تو بہت خوبصورت مقام پر ہم ہیں...... چائے ناشتہ کرنے کے بعد ہم پرائمری اسکول پہنچ گئے اور میں نے جوئن کر لیا......کچھ دیر تک مجھے اس وقت وحشت سی ہونے لگی جب چاچا مجھ سے رخصت ہو کر واپس شہر چلا گیا......

میں سوچوں سے نکل کر تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنے کی خود میں ہمت پیدا کر رہی تھی......اب جو زندگی میں ملا وہی میرا مقدر رہے۔

دن گزرتے گئے......میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا......زونی نے مجھے بہت پیار دیا......میرا بہت خیال رکھا......وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں نے گاؤں والوں کے ساتھ میل جول بڑھایا ایک معلمہ ہونے کے ناطے وہ لوگ مجھ سے خوش اسلوبی سے بات کرتے تھے......گاؤں کی اکثر عورتیں میرا خیال رکھتی تھیں وہ کبھی کبھی کھانے کی چیزیں، جیسے دودھ، دالیں اور سبزی وغیرہ لے آتی تھیں......میں اپنے کمرے میں کھانا خود بناتی تھی اور

علیٰحدہ کمرہ بھی لیا تھا...... کبھی کبھی دوسرے گاؤں میں بھی جا کر میرا وقت کٹ جاتا تھا...... اب سب کا ساتھ پا کر مجھے اپنے گھر والوں کی کمی بھی محسوس نہیں ہوئی......

میں تو نوکری کے لیے دور دراز کے گاؤں آنے سے بہت ڈرتی تھی لیکن میں نے دیکھا کہ زندگی کا اصل مزہ تو گاؤں میں ہی ہے...... یہاں قدرت اپنے بہترین مناظر میں جلوہ گر ہوتی ہے...... ہر طرف ہریالی ہی ہریالی درختوں پر میوؤں سے بھری پڑی شاخیں جھوم رہی ہیں۔ کھلی فضاؤں میں پرندے ناچ رہے ہیں...... یوں زندگی ایک دم خوشگوار ہونے لگی تھی...... پہلے جھیل ڈل کے نظارے تھے اب جنگل کی رونق سب اپنی اپنی جگہ اہم......

شکر اللہ کا پڑھانے کا کام خوش اسلوبی سے ہوتا رہا میں اکیلی عورت ٹیچر تھی اور ایک مرد ماسٹر جی تھا...... میرے ذہن میں ایک خاصا تناؤ تھا...... اس اسکول میں طلباء کی تعداد بہت کم تھی...... بچے پڑھائی میں زیادہ دھیان نہیں دیتے تھے...... کھیل کود میں ہی زیادہ مصروف رہتے تھے...... طلباء اپنی مرضی سے آتے اور چلے جاتے تھے...... مجھے اپنے فرض کا احساس ہو رہا تھا...... ایک دن اسکول جانے سے پہلے میں کھیتوں میں سرسری جائزہ لینے لگی...... وہاں بیٹھے سارے بچے میرے ارد گرد کھڑے ہو گئے...... ان کے کپڑے میلے پرانے اور پھٹے ہوئے تھے۔ لیکن بچے تھے بہت

خوبصورت......

دنیا کے پھولوں میں وہ خوبصورت پھول جیسے تھے۔ خوبصورتی کے باوجود کچھ کی ناک بہہ رہی تھی...... جس سے وہ آستین سے پونچھ لیتے تھے...... میرا جی چاہا کہ میں فوراً ان کا حلیہ درست کروں...... وہ سلام پر سلام کئے جا رہے تھے......

ایک چھوٹی سی ننھی کلی خوبصورت بچی میرے سامنے سے گزر رہی تھی...... جس کے سر پر لکڑیوں کا گٹھا تھا...... مجھے دیکھ کر اس نے بھی سلام کیا...... کچھ مسکرائی اور آگے بڑھ گئی...... میں نے اس کا ہاتھ تھام کر روک لیا۔ اور اسکول نہ آنے کا بہانہ اس سے سننا چاہا اس سے پہلے کہ میں کچھ اور بولتی...... وہ بہت جذباتی ہوگئی اور ماں باپ کی شکایت کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے امنڈنے سے پہلے میں نے اس کے سر سے لکڑی کا گٹھا اتار دیا۔ اور اسے گلے لگا لیا...... اتنی چھوٹی سی عمر کی بچی کے سر پر بوجھ؟ کیسے بے رحم ماں باپ ہوں گے...... جنہوں نے اس معصوم بچی پر رحم نہیں کیا۔

زیتون نام کی یہ پیاری بچی اب میری آنکھوں کے سامنے تھی...... اگر دیہی علاقوں میں بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے حکومت نے محکمہ تعلیم کی جانب سے اشتہاری تحریک چلائی تھی...... لیکن عملی طور پر کچھ نہیں کیا جا رہا تھا...... یہ عیاں ہے کہ جتنی زور و شور سے تحریک شروع

ہوتی ہے۔ اتنی ہی زور سے ٹھنڈی بھی پڑ جاتی ہے...... اپنی ذمہ داری کوئی نہیں سمجھتا...... بچے بہت ذہین ہوتے ہیں...... وہ بھی سوچتے ہیں کیا کرنا ہے کیا نہیں کرنا ہے بچوں کی صحیح تربیت سچی خوشی اور اچھی نشو ونما گھر کی نسبت اسکول میں ملتی ہے...... اس کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کو کبھی اسکول سے دور نہیں رکھنا چاہیے...... اس کے لیے حکومت اور محکمہ تعلیم ہی ذمہ دار ہیں...... ہاں اتنا ضرور ہے۔ ان کے والدین کو صحیح اور غلط سمجھاتے ہوئے مطمئن کر لینا چاہیے، ...... اکثر دیہاتی لوگ، بچوں کو گھر کے کام کاج کرنے پر ہی ترجیح دیتے ہیں......

تھوڑا تھوڑا وقت نکال کر میں نے گاؤں والوں کے گھروں میں جانا شروع کیا...... شہر والوں کی طرح گاؤں والے بھی مہذب ہوتے ہیں...... اور گھر آنے والوں کو خندہ پیشانی سے استقبال کرتے ہیں۔

میں گھر گھر گئی تو خواتین نے نہ صرف استقبال کیا بلکہ بہت خوش بھی ہوئیں...... باتوں باتوں میں چائے قہوہ بھی پیش کرتی رہیں...... بچوں کی تعلیم کے معاملے میں وہ سب میری بات مان جاتی تھیں...... لیکن دو چار گھروں کے سوا بچے اسکول نہیں آئے...... معلوم ہوا کہ بچوں کے باپ اپنی بیویوں کی نہیں مان رہے ہیں...... اور بچوں کو اسکول کے بجائے کسی نہ کسی کام پر لگا رہے ہیں......

یہ مسئلہ واقعی قابل غور تھا...... اور اس پر حکومت کو دھیان دینا چاہیے

تھا......

میری کوشش تو جنون کی حد تک جاری تھی مگر اس کا خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے ہمت نہیں چھوڑی...... بااعتماد عمل اور صحت مند سوچ کے ہوتے ہوئے میں بچوں کا مستقبل خراب نہیں کرنا چاہتی تھی...... ظاہر ہے ابتدا میں کوئی بھی کام کرنے میں مشکلیں آتی ہیں...... ممکن ہے بچوں کے والدین میں بچوں کی پڑھائی میں دلچسپی پیدا ہو جائے۔

اتوار کے روز میں نے زیتوں نام کی کھلتی کلی جیسی بچی کے گھر جانے کا مصمم ارادہ کرلیا...... سننے میں آیا کہ زیتون کا باپ بہت ضدی قسم کا آدمی ہے...... اپنے آپ کو بہت شاطر سمجھتا تھا...... اگر چہ اس کی بیوی عائشہ تھوڑی بہت پڑھی لکھی تھی...... امید ہے وہ میری بات سمجھے۔ مگر ڈر یہ تھا کہ وہ لوگ شاید مجھ سے بات نہیں کریں گے...... لیکن ایسا ہوا نہیں...... وہاں میرا خندہ پیشانی سے استقبال کیا گیا...... بلکہ ضرورت سے زیادہ خاطر داری بھی کی گئی...... ایسا لگتا تھا کہ جیسے انہیں پہلے سے ہی انتظار تھا...... اگر چہ میں کھانے پینے میں ضد کر رہی تھی مگر ان کا دل رکھنے کے لیے کچھ تو لینا ہی پڑا...... کچھ لمحے بعد میں نے اپنا مدعا بیان کیا...... حقیقت ظاہر ہوتے ہی عائشہ اور اس کی بیٹی ریحانہ ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے...... عائشہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئی...... اور ریحانہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی...... اصل بات صاف ظاہر ہوئی انہوں نے مجھے کوئی اور سمجھا تھا...... بلا

ٹیچر کی کوئی اتنی خاطر کرتا۔ ٹیچر بھی وہ جو اُن کے بچوں کو اسکول جانے کے لیے کہنے آئی ہو......

تب عائشہ نے صاف صاف کہہ دیا کہ جس وقت میں ان کے گھر پہنچی تھی...... اسی وقت کچھ لوگ ریحانہ کو دیکھنے آنے والے تھے کیوں کہ ریحانہ بالکل اَن پڑھ تھی...... اس لیے لڑکے والے عین وقت پر گول کر گئے......

اگر ریحانہ تعلیم یافتہ ہوتی تو اسے دیکھنے والے ضرور پسند کرتے کیونکہ وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی......

پھر عائشہ سے زیتون کے بارے میں میری بات چیت ہوئی......تو وہ بہت جذباتی لہجے میں بولی...... یہاں کے اکثر لوگوں کا ذاتی تجربہ ہے کہ علم سے پیٹ نہیں بھرا جاتا ہے اس لیے بچوں سے جینے کا دام وصول کرتے ہیں۔ یعنی مرغ بانگ دیتے ہی پھول جیسی معصوم بچیاں جنگل میں لکڑیاں اور گھاس پھوس اکٹھا کرنے جاتی ہیں...... یہ نہ گئیں تو گھروں میں چولہا نہیں جلے گا اور چوپائیوں کو گھاس پھوس نہیں ملے گا...... میری جیسی عورتیں اپنے اپنے خاوندوں کے رویے سے بے بس دکھائی دیتی ہیں...... آج جو آپ نے خود دیکھ لیا۔ دل میں سکون اور خوشی ملتی اگر ریحانہ اَن پڑھ نہ ہوتی ایسی اور کتنی باتیں ہیں جو بچوں کے خواہش کے مطابق کر سکتے تھے...... حقیقتاً ہم سے غلطیاں سرزد ہوتیں ہیں...... میرے مرد کی سوچ بہت زیادہ غلط

ہے...... بعض اوقات پتہ نہیں چلتا بچوں کو تعلیم کتنی ضرورت ہے۔ وہ تو وقت گزرنے پر احساس ہوتا ہے۔

میں نے زیتون کے بارے میں کہہ دیا جب تک میری ٹیچر پوسٹ اس گاؤں میں رہے گی زیتون کو اپنے پاس رکھوں گی...... اسے پڑھاؤں گی لکھاؤں گی۔ بلکہ دد وسرے بچوں کا بھی خیال رکھوں گی...... ابھی میری پوری بات نہیں ہو پائی تھی کہ عائشہ کے خاوند نے صاف انکار کیا...... وہ جلدی سے آیا اور جلدی میں ہی واپس چلا گیا...... میں بھی وہاں سے نکل گئی...... عائشہ دیکھتی رہ گئی......

رات بھر نیند نہیں آ رہی تھی...... یہ ننھی سی کلی پیاری بچی زیتون مجھے آواز دے رہی ہے...... یہ کیسا ماجرا ہے...... خواب ہے یا حقیقت۔

اسکول جانے سے پہلے اچانک باہر شور وغل برپا ہوا لوگوں کی آہ و زاری صاف سنائی دے رہی تھی...... یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی...... جنگل میں ایک خونخوار ریچھ نے معصوم بچیوں پر حملہ کر دیا...... کچھ بچیاں جان بچا کر بھاگیں دو تین بچیاں زخمی ہوئیں...... سب لوگ جنگل کی طرف دوڑ پڑے اور زخمی خوردہ بچی کو اٹھا کر لے آئے...... وہ کوئی اور بچی نہیں تھی عائشہ کی ننھی منی کلی زیتون تھی......

اور میں دیکھتی رہی......!



پیاسی جھیل

آفتاب کی شعاعوں اور چاند کی روشنی میں زندگی کی سانس جب لی...... اپنے وجود کو پاکیزگی کے رنگین ماحول سے ہمکنار کر کے نکل پڑی تھی...... ایک نئی نویلی دلہن کی مانند برفیلے پہاڑوں سے اتر کر دھرتی کے آغوش میں سما گئی تھی...... دھوپ اور چھاؤں میں زندگی کا سفر شروع ہوا...... میری گہرائی اور خاموشی داستان شیرین زبان بن کر جلوہ افروز ہوئی تھی...... بادِسحر اور شب کی چاندنی سے امیدوں اور آرزوؤں کی لکیریں میرے سینے پر کھینچی گئیں......

اگرچہ میری گہرائیوں میں سکوت اور خاموشی پنہاں تھی...... میں چپ بھی تھی...... اور ہنستی بھی تھی...... تلملاتی بھی تھی...... ہر رنگ میں بہہ نکلنے کی تمنا بھی تھی......

لعل وجواہر سے آراستہ میرا وجود کوہساروں کی نگرانی میں میری روح آزاد فضاؤں میں داخل ہوئی تھی...... ہر چیز حسین، دلکش، دلفریب لگنے لگی تھی......

جو رچی بسی قدرتی مہک ذہن ودل کو بخشتی تھی...... میرے اردگرد کلیوں کا جوبن، کنول کے پھولوں کا تبسم اور مہک میرے دامن میں سما گئی

تھی......

میٹھی میٹھی چٹکیاں لیتے ہوئے ہزاروں پرندوں کو ان کے رزق کا ٹھکانہ مل گیا تھا......لہراتے پانی میں خاموش مچھلیاں اپنی زندگی کو لٹاتے لٹاتے مجھے اپنی قسمت سے منسوب کرنے پر عمل پیرا رہی تھیں......طرح طرح کی رنگین بطخوں اور پنچھیوں کو میرے ساتھ کھیلنے میں بڑا مزہ آرہا تھا......مہاجر پرندے بہار کے موسم میں میرے ٹھنڈے پانے سے جلتے بدن کو نہلاتے رہے۔ میں بھی ان پرندوں کی تمنائی ہوتی تھی......جب وہ پیاس بجھانے میری چھاتی سے چمٹ جاتے تھے......

ابابیلوں کے علاوہ ایسے کچھ پرندے قطاروں میں آکر اپنی شناخت اہل نظر سے کرا رہے تھے......اُن کی محبت اور شفقت سے دل ایک دم مچل رہا تھا......وہ میرے ساتھ شیئر کرنے کے شوق میں میرے اردگرد جمگھٹا لگاتے رہتے تھے......

حقیقت کی دنیا میں میری زندگی انہیں پرندوں کے ساتھ وابستہ ہوئی تھی......

اگرچہ میری زندگی لہراتی بل کھاتی جھومتی نظر آرہی تھی......لیکن کبھی کبھی ان مراحل سے بھی گزرنا پڑتا تھا۔ جہاں اپنا حسین چہرہ چھپانے کے لیے (کِھل وتھروں) کنول کے پتوں کا سہارا لینا پڑا تھا......تاکہ اپنے وجود کو دنیا کی نظروں سے چھپایا جائے اور خوف کی لہریں نہ اُٹھیں......جہاں

زندگی وہاں فکروں کا انبار ضرور ہوتا ہے......

لیکن اب تک میرے سینے کے اندر لذت اور سرور کے چشمے پھوٹ پڑے تھے......میری روانی اور استقلال برقرار تھا......

پربتوں سے اُبلتے جھرنے اور کوہساروں کے دامن سے نکل کر بہتے ہوئے چشمے اسی مستی میں چھلانگ لگا کر میرے ساتھ بغل گیر ہو رہے تھے......

جب میں نظریں اٹھاتی تھیں...... ہر سمت رنگ ہی رنگ بکھرتے نظر آرہے تھے...... بدلتے موسم میں جب بہار کا موسم شروع ہوتا تھا...... پھولوں کی خوشبوؤں سے فضا معطر ہو رہی تھی......ان پھولوں پر بھنورے، تتلیاں منڈلانے لگیں تھیں...... میں جذبات کی رو میں بہہ کر ان کے اس ارادے میں ہمیشہ گامزن رہی تھی...... رات دن اک سفر اک جستجو میں کبھی ٹھہری نہیں...... دل میں اسی چاہت کا یقین لیے ہوئے کھیل کھیل میں گزری کبھی پھولوں کے ساتھ، کبھی پرندوں کے ساتھ، کبھی مچھلیوں کے ساتھ تو کبھی چھوٹے موٹے کیڑوں کے ساتھ...... کبھی سورج کی کرنوں کو اپنے ساتھ سمیٹ لیا تھا تو کبھی چاند کو دامن میں بسا لیا تھا۔

ستارے جب میرے بدن پر نور کی کرنیں بکھیرتے آرزوؤں کا ایک نقش چھوڑ جاتے تھے...... پری محل سے بے تاب پریاں پانی کی گہرائیوں میں (ونہ وُن) کشمیری گیتوں سے ترنم پیدا کرتی تھیں......اور

سازوسُر میں مجھے جگادیتی تھیں......میں ساری رات جاگ کر قلب وذہن کو محسور کرتی تھی......محبت کی ادائیں دوسرے کے ساتھ خود بخود مائل ہوجاتیں تھیں......وہ سحر طلوع ہونے سے پہلے ہی چشمہ شاہی کی بارہ دریوں میں گھر جاتیں تھیں......صرف ان کے یہاں دلکش نغمے باقی رہ جاتے تھے......اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ گیتوں کا سربستہ خمار دنیا تک کو محسور و مدہوش کردیتا ہے۔

بادصبا کے آتے ہی گلوں پہ بلبل عشق نچھاور کرنے کے لیے نالاں رہتی تھی......یوں اس طرح آنکھوں میں ایک خوبصورت سی دنیا بستی تھی......اس ان خوشیوں میں میرا دل پرکیف لمحوں کے ساتھ وابستہ ہوگیا تھا۔

میرے کناروں پر درختوں کی شادابی، باغوں اور لہلاتے کھیتوں کی ہریالی سے دائمی مسرت ملتی تھی اور خود وہ میرے ساتھ اپنی کہانی سنانے لگتے تھے۔ جو کہانی اس روے زمین کے اندر پوشیدہ ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ میرے اردگرد خانقاہیں، زیارت گاہیں، عبادت گاہیں میرے کسی مشکل کو خاطر میں نہیں لاتیں......کبھی کسی راستے کی رکاوٹ بننے نہیں دیتیں......انہی خانقاہوں، زیارت گاہوں، عبادت گاہوں کی بدولت رواں دواں رہی اور جس انداز سے بہہ رہی تھی معطر یادوں کے ساتھ ہرسو بہہ رہی تھی......کوہساروں سے جو اُترتی آئی ہوں اس خطہ فردوس سے بطور خاص اُنس رہا۔ کس قدر میری گہرائیوں میں ڈوب کر

عاشقوں کا دل مچل اٹھتا تھا...... بے قراروں کو قرار آجاتا تھا تشنگیوں کو لب دریا ملتا تھا...... زندگی کی راہوں پر ثابت قدمی کے ساتھ چلنے کے لیے سب کو آمادہ کر ہی لیتی تھی...... واقعی اپنے عزم واعتماد سے عزت اور شہرت بھی ملی تھی...... میری گہرائیوں میں ذرہ ذرہ مہک اٹھتا تھا۔ بہار کے موسم میں جب سورج کی شعائیں ان پر پڑتی تھیں......

وقت اور موسم ایک جیسا نہیں رہتا...... بدلتے موسم میں اگر چہ موسم بہار نے رخصتی لی...... آنے والے موسم کی بدولت میری رفتار میں کوئی ٹھہراؤ نہیں آیا...... میری اپنی زندگی پر اس ماحول میں بھی یوں لگتا ہے۔ کہ موسم بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا...... حسن زیبائش سے آج بھی مالا مال ہوں جو بہار کے موسم میں خوشنمائی پائی تھی...... وہ کبھی ختم نہیں ہوگی......

اب کے موسم خزاں میں بھی سرد ہواؤں کے جھونکوں سے دائمی مسرت ملتی تھی......

پرندے نغموں میں سراپا، خوبصوت بطخین گنگناتی ہوئی اپنا رخت سفر باندھ رہی تھیں۔...... مچھلیاں میری گہرائیوں میں تیرتی پھرتیں ایک دوسرے سے سبقت لے رہی ہیں اس موسم میں مینڈکیں پھدک پھدک رہی ہیں اور ٹرٹرانے کی آوازیں بھی خاموشی میں راحت بن جاتی تھیں......

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سورج کی گرم شعائیں بھی معدوم ہوگئیں تھیں...... سرد ہواؤں کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا...... اکثر مہاجر

پرندوں نے بھی راہ فرار اختیار کی تھی...... جب میرے جسم پر برف کی سفید چادر بچھ چکی تھی......لیکن اس یخ بستہ ماحول میں بھی میرے جسم کی حرارت میں کوئی کمی نہیں ہوئی......میرے جسم کا اندرونی حصہ تپ رہا تھا......

میرے آس پاس کے پرندے بھی نغمہ سرا ہو رہے تھے......اکثر اس برف کے موسم میں (پند چوں) ننھے منے پرندوں کا جھنڈ میری چھاتی پر اس طرح محو ہو جاتا ہے کہ جیسے وہ میرا شیدائی ہو...... بظاہر ان کا یہی مسکن تھا......وہ دوڑتے، پھسلتے، اُچھلتے میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگتے تھے......خود میں ان کے ساتھ وقت گزار کر زندگی پر نازاں ہو جاتی تھی......

وقت گزرنے کے ساتھ موسموں کا بدلنا بھی قدرتی عمل دخل ہے......ہر موسم میں ہر چیز بدل جاتی ہے۔

جب کبھی بدلتے موسموں کی وجہ سے میری ہیئت میں بدلاؤ آجاتا تھا۔ کبھی خوشیوں کے ساتھ غموں کا لبادہ بھی اوڑھنا پڑتا تھا...... یہ جان کر کہ زندگی سکھ کا گھر ہی نہیں ہے بلکہ کبھی دکھ بھی سوچنے پر مجبور کرتی ہے...... جب کبھی آندھی یا طوفان آجاتا تھا۔ سوچتی تھی کہ قانونِ قدرت میں ایک ہی ذائقہ کیسے ہو سکتا ہے......کبھی کبھی قدرت کی آزمائشوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

جب کبھی اس طوفان اور آندھی سے میرے سینہ پر میلی دھول کی چادر سی بچھ جاتی تھی......تو بارشیں آکر صاف کر دیتی تھیں...... بارش اس

طرح میری چھاتی پر بلبلیں پیدا کر دیتی تھی کی میں گا رہی ہوں اور کوئی ساز بجا رہا ہے......اس طرح اس کھیل میں رچی بسی ہم آہنگی کی تائید ہوتی تھی...... جہاں قدرت کی ہر نعمت سے واقف ہو چکی تھی......

اس عالم وجود میں فقط پیڑ، رنگ برنگے پھولوں، اڑتے پھرتے پرندوں یا مچھلیوں سے ہی رونق نہیں تھی...... پہاڑوں کی آغوش میں بسنے والے لوگ بظاہر انسان کی شکل میں فرشتے دکھائی دے رہے تھے وہ میرے حسن پر فریفتہ ہو گئے تھے......ان کی وجہ سے میری قدر و قیمت بڑھ گئی تھی...... جیسے آزاد فضاؤں میں داخل ہو کر ہر چیز حسین تر ہو جاتی ہے......سب سے بڑا معجزہ جب بادشاہوں، شہزادوں ملکاؤں نے میرے ارد گرد ڈیرا جما لیا تھا......میری سطح آب کی خاموشی میں قہقہہ گونجنے لگا......وہ میرے ساتھ کھیل میں مصروف بھی رہے اور مشغول بھی رہے تھے۔

شاہجہاں و جہانگیر نے میرے بغل میں پرکشش اور دلفریب باغ تعمیر کروائے......اس طرح میری قدر و قیمت میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ جیسے چشمہ شاہی، نشاط باغ، شالیمار باغ۔

حسن و زیبائش کے اعتبار سے جس طرح ایک دلہن کو سونے اور جواہرات سے رئیس اور پرکشش بنا دیتے ہیں......اسی طرح بڈشاہ زین العابدین نے میرے حسن کو دوبالا کرنے کے لیے سونہ لانک اور روپہ لانک جیسے دلہن کے دونوں کانوں کو جھمکوں سے سجایا سنوارا تھا...... ہر نعمت سے

مالا مال ہوگئی تھی......اور تقدیر نے نصیب جگا دیے جب چھوٹی چھوٹی کشتیاں رقص کرتی ہوئی نظر آنے لگیں......ان میں بیٹھ کر لوگ سیر کرنے لگے تھے......

میں اپنی استقامت لہروں کے سبب ان لوگوں کے ساتھ شیئر کرنے لگی......خلوص دل سے ان کے ساتھ میل جول بڑھایا تھا......

ہر گوشے میں دلکش تصویر ہر آنکھ میں بھانے لگی تھی......اب تو سارے لوگ میری چھاتی پر گزرنے کی پہل کرنے لگے تھے...... جہاں جی چاہا وہاں بے خوف وخطر راستہ بنانے کے لیے پانی اچھالا......

اس حسین سفر میں جہاں زندگی حسین تر ہو جاتی ہے......دل کے ارد گرد مہکتی کلیوں نے کنول کے پھولوں پر جان نچھاور کی۔

اب تو میرا دل اور بھی پر کیف لمحوں کے ساتھ وابستہ ہو گیا تھا......جب خانقاہوں، درگاہوں، مسجد کے میناروں نے میرا دامن تھام لیا تھا ایک دم میری اٹھتی ہوئی لہریں پرسکون بن گئی تھی......

ہر ایک گوشے میں بکھری ہوئی دعا کی خوشبو ہے

عقیدتوں سے بھرا مشکد ان ہے حضرت بل

ان نعمتوں سے مالا مال ہو گیا تھا......درگاہوں، خانقاہوں، مسجد کے میناروں میں جا کر قلب وروح کو تراوت اور امیدوں کے چراغ روشن نظر آنے لگے ہر کوئی کشاں کشاں آنکھ دیکھ کر اپنی تعبیر نظر آتی...... ہر سفر

دیدار و دلفریب بن گیا تھا......

جوش اور مستی کے عالم میں ہر شام وسحر اُن لوگوں کے ساتھ تشفی بخش رہی تھی......

پہاڑوں، کوہساروں کے دریچوں سے صدائیں آنے لگیں......جن پر قسمت مہربان ہوگئی تھی۔ میرے ساتھ ہمسفر ہو گئے تھے......

سورج کی تپش سے جلتے بدنوں کو اپنی جھیل میں ڈبو کر زندگی کی تازگی بخش دی...... ہر سمت میری شہرت، خوشبوؤں کی طلب گار میری زندگی سے آشنا ہوگئی......سیر وتفریح کے پرستار بکھرے خواب کے مزے لوٹ رہے ہیں......میرے شانے پر بکھری ہوئی زلفوں میں اہل نظر شاعری سنانے لگے تھے......میرے اطراف میں خوبصورت اور پائیدار درخت کھڑے ہیں......ان پر پرندے جوق در جوق آشیانے سجانے لگے تھے......

اگرچہ انسانوں کے چہروں پر محبت اور شرافت جھلکتی تھی......لگتا ہے انسان محبت کے شیدائی ہیں......وہ ہر حسن اور خوبصورتی پر مر مٹتے ہیں......

جب محبت پروان چڑھتی ہے......تو کوئی بھی چیز بری یا اچھی دکھائی دیتی ہے......سب کچھ اپنے موافق لگتا ہے۔......

گزرے ہوئے وقت سے جن امیدوں کے چراغوں کو روشن کئے بہہ رہی تھی......کیا پتہ تھا آنے والا وقت بدنصیبی کے دستک دے گا......وقت

نے جس انداز سے کروٹ بدلی میں سوچنے پر مجبور ہوگئی...... کہ انسانوں کی خاطر میری زندگی پرامید اور پراختیار گزرے گی۔ اب تو وہ اختیار اُن گھٹیا انسانوں کے ارادوں کی وجہ سے ٹوٹ گئے...... اگرچہ ان شاطر لوگوں کے ذہنوں کا سامنا کرنے کی خود کو ہمت جٹا رہی تھی...... لیکن راستہ ہموار دکھائی نہیں دے رہا تھا......

چھوٹی چھوٹی کشتیوں کا بوجھ تو سہنے کی جرأت کی تھی...... لیکن اب تو یہ چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی کسی بوجھ سے کم دکھائی نہیں دے رہی تھیں...... اب تو بڑے بڑے ڈونگے میرے سینے پر اتارنے لگے۔ ان کے ان رویوں کے خلاف ہوکر بھی سر تسلیم کر چکی تھی...... لیکن آنے والے وقت سے بہت ڈر رہی تھی...... کیونکہ یہ لوگ بڑے شاطر لوگ ہیں۔ ان میں کوئی ایمان یا اخلاق اور اخلاص نہیں دکھائی دے رہا تھا...... یہ صرف اپنے کاروبار کی خاطر مجھ سے میل جول بڑھا رہے تھے...... وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شاطر چالیں سمجھنے لگی تھی۔

اب تو عام سی بات بھی اذیت اور خوف سے کم نہ تھی بڑے بڑے ''کھچوں'' کے ذریعے مٹی لاد کر میرے شعور کی گہرائیوں میں جیسے مٹی نہیں بلکہ انگارے بھر دیے گئے میری پاکیزگی پر داغ لگانے والے یہی وہ لوگ ہیں جن کے چہروں پر خوف کی نشانی بھی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔

ہر چند کہ قصوروار میں ہی ہوں۔ جو آبشاروں کی طرح اچھلتی کودتی

نہیں بلکہ سکوت میں رہتی ہوں......خدا کا شکر ہے کہ اس سکوت میں اپنی انفرادیت کسی حد تک قائم و دائم ہے۔

اپنی فطرت سے اگرچہ بالاتر ہو کر جی رہی تھی برعکس انسانی فطرت سے ناواقف نہیں تھی۔ بظاہر آنے والا طوفان کسی بڑے خطرے سے کم نہیں تھا۔ اور جان لیوا حملہ سے کم نہ تھا...... جو ہو رہا تھا انسان شیطان ہی کر سکتا ہے......ان شیطانی کارناموں سے میری عظمت کی گہرائی سکڑتی جا رہی ہے......اور میں اُف تک نہ کر سکی تھی۔

انہوں نے تو بس خرید و فروخت کے ضمن میں سچائی سے کام لیا اور وارث پر وار کیا......اور سکون سے چلنے پھرنے کی آزادی چھین کر صرف اپنی خواہشات کی تکمیل کی......

کہتے ہیں کسی حسین اور خوبصورت چیز پر انسان اس کے حسن اور خوبصورتی قائم و دائم رکھنے کے لیے اپنی جان لٹا دیتا ہے...... یہاں تو عذر گناہ بدتر از گناہ مکاری اور شاطرانہ جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

وقت کے ہاتھوں ان کی خودی اور شاطرانہ سوچ کیا درست ثابت ہو گی بظاہر وہ اس کارنامے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں یہ بھول جاتے ہیں جتنا کوئی اپنے آپ کو پانی میں ڈبو لیتا ہے اتنا ہی وہ پیاسا ہی رہتا ہے۔

یہ انصاف کی بات ہے۔ میں کس سے ظاہر کروں میرے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے جزیرہ نما حصے بنا کے آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ ان

حصوں پر اونچے اونچے ہوٹل، مکانات تعمیر کر کے اپنی عیاشی کے لیے مجھے در گور کیا......زندہ نہ رکھنے کی کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ میری پاکیزگی کا تقدس اپنے گندے وچاروں سے پامال کر دیا۔ ان کے اس طریقہ کار سے اب تو خوشبوؤں کے احساس کے بدلے بدبوئیں پھیلتی گئیں اب تو مہلک بیماری سے وہ بھی بچ نہ پائیں گے جو مجھے اللہ تعالیٰ نے امانت کے طور چھوٹی موٹی چٹکیاں لیتے ہوئے آبی جانور خوبصورت ننھی مچھلیاں، جگمگ جگمگ کرتے پنچھی، ہنستی شور مچاتی بطخیں، ٹرٹراتے ہوئے ساز و سُر میں مینڈکیں دی تھیں اب تو وہ راہ فرار اختیار کرتی ہوئی نظر آنے لگی ہیں۔ اس ماحول سے سہمے ہوئے محبت کرنے والوں کا وجود ہی نہ رہا......

ایک چپ سی لگی......دل کے درد کی کوئی انتہا نہ رہی۔

میرا مقام اس گھناؤنی حرکت سے اور زیادہ بدظن ہو گیا تھا جب بڑے بڑے ہاؤس بوٹ کناروں کو چھوڑ کر میری چھاتی پر سوار ہو گئے تھے......ان ہاؤس بوٹوں کی خوبصورتی، رنگینی اور دلکشی سے لوگوں کا من تو بھاتا تھا......لیکن جو قربانی میں دے رہی تھی میری زندگی اجیرن بن گئی تھی۔ قدرت کی رنگینیاں جو میری ذات سے وابستہ تھیں یہ ساری رنگینیاں بے معنی ہو کے رہ گئی تھیں......

اپنی پناہ میں کھلتے ہوئے کنول کے پھولوں کا چہرہ کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئے......سارے بندھن جو جاندار اور بے جانوں سے جوڑ چکی تھی

سب ختم ہو گئے...... میری صورت روز بروز غلاظت اور گندگی سے بھر پور ہو جاتی ہے۔ جو آئینے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اب تو وہ بدنما داغ سے بھی بدتر ہو گئی......

اب تو ہر طرف سے کشتیوں، ہاؤس بوٹوں، ڈُنگوں کے علاوہ پتھروں کی دیواریں پھیل گئی ہیں سارا بوجھ سہنے کی ہمت ٹوٹ گئی......

انہوں نے جیسے خوشبوؤں اور تمناؤں کی زندگی کی بازی جیت لی۔ بظاہر ان کے چہروں پر امید کی کرنیں نظر آتی ہوں گی...... ہر طرف رنگ ہی رنگ نظر آتا ہوگا...... انہوں نے کاروبار کرنے کے لیے اپنا وسیلہ ڈھونڈ لیا...... ان کے آنکھوں میں اس وقت دھنک کے رنگ، لبوں پر مسکراہٹ ہے۔

تعمیراتی مکانوں، خوشنما ہاؤس بوٹوں سے بکھیرتی ہوئی ساری غلاظت و کثافت پھیلا کر شیطانوں کے روپ میں ظاہری طور پر اس دھرتی پر وارد ہونے والے۔ یہ تو اشرف المخلوقات ہیں جو فرشتوں سے کم نہیں۔ لیکن اپنی ہوس نے ان کو اشرف المخلوقات سے شیطان بنا دیا۔

میری شادمان زندگی کو یہ صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے لیے کمر بستہ ہو گئے......

جوں جوں موسم بدلتے رہے...... ہر موسم میں اپنی ایک انفرادی قوت ہوتی ہے...... ہر موسم میں عنایت بھری نظروں سے تکتے رہی

تھی......اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے جاودانی بخشی، پریوں اور فرشتوں نے سواگت کیا...... مجھے جھیل کے نام سے نوازا گیا تھا...... بادشاہوں اور ملکاؤں نے اپنی جان نچھاور کی......میں تو وسیع تر آب جوے تھی...... لامحدود نظاروں اور آبشاروں کی خوش قسمت جھیل تھی......

جن مراحل سے اب گزرنا پڑ رہا ہے۔ کس سے بچھڑ کر کس طرح رہا جاتا ہے اس کا احساس تو نہیں رہا......اب تو اتنی سکڑ گئی ہوں چاند اور سورج بھی مجھے پہچاننے سے انکار کر رہے ہیں...... جو کسی کے درد کو محسوس نہ کرے وہ خدا کے بندے کیسے ہو سکتے ہیں اور جنہوں نے میری روح و اعضاء کو بھی نہیں چھوڑا......جن کے بنا میری زندگی بے نام اور بے اثر ہے جو پرندے موسموں کے لحاظ سے میرے ساتھ خوشنما بولیوں سے دل کو لبھاتے تھے......وہ سب غائب ہو گئے۔ کوئی پتہ نہیں اُن کے ٹھکانوں کا......کیوں چلے مجھے چھوڑ کر؟ شیطانی طاقتوں کے ظلم و استبداد سے۔اس دور میں انسانیت شیطانیت بن گئی یہ وہی لوگ ہیں، جنہوں نے آب رواں کو صحرا بنا دیا پانی کے ذخیرے کو مٹی سے بھر کر ہموار بنا دیا......اس پر سبزیاں ترکاریوں اگانے کا جنون سوار ہوا کسی کی پرواہ کئے بغیر صرف اپنی خاطر......اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے لیے مجھے کچھ کہنے کا موقعہ نہیں دیا۔ میں تلملاتی، اچھلتی کودتی لیکن صبر، استقامت، سکوت اللہ تعالیٰ نے مجھے ہی کیوں اس آزمائش میں مبتلا کیا۔

اب تو یہ قدرت کی ساری رنگینیاں بے معنی رہ گئی ہیں۔

اگرچہ اس گھناؤنی حرکت سے میرا دل دہل گیا۔انہوں نے جیسے جیسے تمناؤں کی بازی جیت لی......وہ اس بات سے بے خبر ہیں میرا وسیلہ ان کے لیے بھی ختم ہو جائے گا......

اگرچہ انسان دنیاوی لالچ میں پھنس کر صرف عیش وعشرت کی زندگی کو ترجیح دیں گے۔مانو کہ اس وقت ان کے چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹ ہے یہ صرف وقتی طور پر ہے...... یہ خود پیاسے رہ جائیں گے۔پانی کی ایک ایک بوند کے لیے ترسیں گے۔

اس وقت جو المیہ میرے ساتھ ہو رہا ہے۔اس کا اندازہ نہ تھا اتنے پتھروں کا سواگت کیسے کروں۔اس بوجھ سے دم گھٹ رہا ہے......خود پیاس بجھانے کے لیے ترس رہی ہوں......اب نہ زندگی ہے نہ ہی موت......!!!!



اونچی اڑان

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی...... میرے ابو جمال الدین جیسے تھک چکا تھے...... بیڈ کی پشت سے ٹیک لگانا چاہا...... بے اختیار لبوں سے آہ نکلی...... تکلیف کو برداشت کرنے میں اپنی ساری قوت صرف کرنے لگا......

''کیا بہت درد ہے......'' میں نے ابو کو سہارا دے کر پوچھا...... ''نہیں اب تو کسی درد کا احساس نہیں رہا'' ...... دھیرے سے اپنا جسم میرے سے الگ کیا......

ہمارے خیال میں کافی دنوں سے ان کی طبیعت بگڑ رہی تھی لیکن وہ ہم سے چھپا رہا تھا...... جب درد کی انتہا ہو جائے تب اس کی شدت محسوس ہوتی ہے...... اور آج وہ درد سے کراہ رہا تھا...... میری ماں فاطمہ ان کے ماتھے کا پسینہ اپنے آنچل میں جذب کر رہی تھی...... میں نے فوراً پانی کا گلاس ان کے کانپتے ہوئے ہونٹوں تک لگا لیا...... مشکل سے پانی کے دو چار گھونٹ لینے سے شاید درد میں افاقہ ہوا...... لیکن چند منٹوں کی خاموشی کے بعد وہ پھر بے چینی کی حالت میں ہونٹ چبانے لگا...... ہم دونوں ماں بیٹی ان کے اس درد سے بے بس ہو گئے کچھ سوجھائی نہیں دے رہا تھا...... میرا بڑا بھائی انور

کام کے سلسلے میں دلی چلا گیا تھا...... ماں اسے فون پر بات کرنے کے لیے بہت ضد کر رہی تھی...... میں اس لیے منع کر گئی وہ بہت پریشان ہو جائے گا......اور اتنی رات کے وقت......اور پھر یہ درد تو ابو کو کئی بار جھیلنا پڑا تھا...... لیکن میری ماں اس کا درد دل میں محسوس کر رہی تھی وہ بے چین ہو رہی تھی...... کچھ دیر کے لیے ابو بھی خاموش ہو گئے تھے......

ماں اس کی خاموشی سے بہت گھبرا گئی تھی۔

''تحمل رکھو بیٹی۔'' ابو اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولا کیسے سنبھالے ہم اپنے آپ کو......لمحہ لمحہ وہ درد سے کراہ رہا تھا یہ رات بھی لمبی ہوتی جا رہی تھی......صبح تو آتی ہی نہیں...... میں بار بار کھڑکی کے پٹ کھول کر اس اندھیری رات میں سورج کی کرنوں کو انتظار کر رہی تھی......اور کانوں سے پرندوں کی آوازیں سننے کے لیے بے چین ہو رہی تھی جو کائنات کو جگاتے ہیں۔

اضطرابی کیفیت سے یہ رات تو کٹ گئی صبح ہوتے ہی میں اکیلی ابو کے ساتھ ہسپتال آ گئی تھی میری چھوٹی بہن جمیلہ کی وجہ سے ماں گھر پر ہی ٹھہری پہلی بار ابو کے ساتھ شہر کے اس ہسپتال کے گیٹ کے اندر داخل ہو گئی......لان کو عبور کر کے بیماروں اور تیمارداروں کی بھیڑ دیکھ کر میں حوصلہ ہی کھو بیٹھی تھی......اپنی تھکاوٹ اور ساری رات نیند نہ کرنے کی وجہ سے میرا جسم بھاری ہو رہا تھا۔ باوجود ابو کے ہوتے ہوئے میں نے اپنے آپ کو

سنبھالا...... ابو نے بھی میرے ساتھ ہمدردی جتائی...... کچھ اندازہ نہیں ہوا کہ ہم اتنی جلدی کیجولٹی کے اندر کیسے داخل ہوئے...... کئی لمحے گزرنے کے بعد ہی ڈاکٹر نے پریشان صورتحال دیکھ کر مجھے تسلی دی اور فوراً ابو کا معائنہ کیا۔

یہ جان کر دل میں بے چینی دور ہوگئی ڈاکٹر صاحب نے بتادیا کہ پریشانی نے ان کے اعصاب کو متاثر کیا ہے......اور کچھ ڈپریشن بھی ہے...... خطرے کی کوئی بات نہیں جلدی ٹھیک ہوجائیں گے......انجکشن لگا کر اور کچھ دوائیاں لکھ کر میرے ہاتھ میں چٹ تھمادی دل میں ایک امید سی جاگ اٹھی تھی...... دیکھا تو ابو بھی نارمل صورت میں تھے......اور خوشیاں لوٹ کر واپس گھر آ گئیں......

چند دنوں کے مکمل آرام کرنے سے اگر چہ ابو کی طبیعت بحال ہوئی مگر ان کے ذہن میں کئی سوالات ابھر رہے تھے۔ جن کا جواب انہیں مل نہیں رہا تھا...... جس ذہنی انتشار میں وہ مبتلا ہو رہے تھے۔ اس حقیقت سے نکل نہیں پا رہے تھے......

اصل میں جب ہم گاؤں چھوڑ کر شہر بسنے چلے آئے تب سے ابو بے حال سے ہو گئے...... پہلے پہلے اگر چہ گاؤں کا وہ پرانا گھر چھوڑ کر شہر کی نئی کوٹھی میں خوشیاں بٹورنے لگے تھے لیکن آہستہ آہستہ پرانے گھر کی یادیں سب کو ستانے لگیں...... ابو تو زیادہ ہی سوچنے لگے......

دراصل پیسے کی فراوانی اور آزاد ماحول نے میرے بڑے بھائی انور کو یکسر بدل دیا...... انہوں نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد گاؤں چھوڑ کر شہر میں بسنے کی ٹھان لی جواب تک ہمیں راس نہیں آیا......

ماں بھی کچھ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی...... اپنوں سے بچھڑنے کے بعد رشتہ داری میں دراڑیں آ گئیں...... یہاں تو کسی سے ملنا تو دور بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے...... جب اپنا کوئی گم ہو جائے تو یہ دیکھ کر انسان کے وجود پر حملہ کر دیتا ہے...... یہی حملہ پورے پریوار کو سرایت کر گیا پرانی یادیں جیسے آسمان کی وسعتوں میں اڑنے والے پرندے اچانک پنجرے میں بند ہو گئے یا تو ان کے پر کاٹ دیے گئے......

اکثر دیکھنے میں آیا بیٹے کی غلطی کی وجہ سے باپ کے مزاج میں تیزی آتی ہے...... برعکس ابو تو بالکل خاموش ہو گئے...... نڈھال ہو گئے...... نہ کچھ بولتے ہیں نہ سننے کی خواہش ہے......

اس بات سے انکار نہیں جب سے گاؤں چھوڑ کر آئے...... ابو کو نہ دن کا پتہ کہ کب چڑھا اور رات کب گزر گئی...... گاؤں میں صبح مرغ بانگ دیتے ہی ابو کھیتوں کی طرف نکل جاتے تھے...... پیڑ پودوں کی دیکھ بھال کرتے تھے کھیتوں میں پانی کی سینچائی کرتے تھے...... دن میں دو چار بار ہی گھر آ جاتے تھے...... کبھی کبھار تو مجھے ہی ان کے لیے چائے روٹی وغیرہ کھیتوں میں لے جانی پڑتی تھی...... جب تک وہ چائے پی نہیں لیتے

تھے۔ میں کھیتوں میں سیر کرتی رہتی تھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ......اس کے بعد گھر لوٹتے ہی اسکول جاتی تھی ......اکثر دن کا کھانا بھی ابو کھیت پر ہی پڑوسیوں کے ساتھ مل کر کھا لیتے تھے......

محمد اکبر جو، عبدالرحیم چاچا، محمد سبحان ملک اور دیگر ساتھی سب آپس میں خوشیاں بانٹتے تھے......کبھی کبھی ایک دوسرے کے ساتھ تیز کلامی بھی کرتے رہتے تھے......لیکن زیادہ تر وہ خوش اسلوبی سے آپس میں پیش آتے تھے......اور ایک دوسرے کے کاموں میں بھی جٹ جاتے تھے۔

اب اچانک یہ درد کیسے اٹھا......جس کا کوئی علاج نظر نہیں آتا ہے......اب تو ابو بالکل اکیلے اپنے کمرے کے کھڑکی کی پٹ کھول کر دور خلا کو تک رہے ہیں......کوئی ان کے کمرے کا دروازہ کھولنے پر بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا...... جیسے وہ بے حس و حرکت ہو گئے......ایسے حالات کی وجہ سے ہم بہت گھبرا گئے......

یہ تو بالکل صحیح ہے کہ ابو کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی وہ جیسے انہوں نے بہت کچھ کھویا ہے......دنیا میں ایسی کتنی مجبوریاں خاموش رہنے پر مجبور کرتی ہیں......

ایک دن ہم سب نے طے کر لیا تھا......وہ دو چار دنوں کے لیے گاؤں جا کر ہمسایوں سے ملنے کے لیے اور رشتہ پھر سے جوڑنے کے لیے چلے جائے لیکن ابو نے بالکل منع کیا۔

یہ بات تو ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ ابو ہی کیوں منع کرتے ہیں حالانکہ ہم ان کی خوشی کے لیے گاؤں جانے کے لیے ضد کر رہے ہیں جہاں وہ اپنے قریب کے لوگوں سے خاص کر عبدالرحیم، محمد اکبر، محمد سبحان ملک وغیرہ سے ملیں گے......تاکہ ان کی طبیعت میں بدلاؤ آئے......اور ڈپریشن سے نجات ملے......

''یہ ہمارا جیسا گاؤں نہیں جہاں گھروں کی حفاظت ہمسایوں سے ہوتی ہے......دن بھر گھروں کو چھوڑ کر کھیتوں میں جٹ جاتے ہیں......

یہ شہر ہے......اونچی اونچی کوٹھیاں تو ضرور ہیں...... لیکن یہ گھر نہیں ہے...... یہ کوٹھی اونچی اونچی دیواروں میں قید ہے کسی بھی ہمسایہ کی نظروں سے غافل و محفوظ ذرا سی بھی لاپروائی سے مکان کی کھڑکیاں اور دروازے بھی بچ نہ پائیں گے۔'' ابو نے تاکید سے کہا......

یہ تو ابو کا فیصلہ تھا......دل میں اٹھتی درد کی لہر کو دبا کر انہوں نے کہا جو ہمیں قبول کرنا پڑا۔

چند دنوں کی پریشانیوں سے نکل کر گھر میں کچھ سکون تھا......سب کام کاج میں مصروف رہے۔ماں پوری طرح سے ابو کی خبر گیری کرتی رہی تھی......میں تو امتحان دے چکی تھی......جمیلہ اسکول بدستور جاتی رہی......ان کا ایڈمشن بھی اسی شہر کے اسکول میں ہوا تھا......

وقت یوں ہی گزرتا گیا......میرا بھائی انور کبھی کبھار گھر آتا ہے......

زیادہ تر باہر ہی کام میں مصروف رہتا...... کبھی دلی، تو کبھی پنجاب...... کوئی بھی مستقل ٹھکانہ نہیں ان کا......

ایک دن صبح سویرے ہم سب اکٹھے چائے ناشتہ کر رہے تھے...... اچانک گیٹ پر کوئی (Bell) بجا رہا تھا...... ہم سب چونک سے گئے...... اس لیے کہ مدت کے بعد کوئی ہمارے گھر کی چوکھٹ پر تشریف لائے۔ میں نے جلدی سے گیٹ کھول دیا...... عبدالرحیم چاچا کو دیکھ کر حیرت زدہ ہوگئی تھی...... ان کی بیٹی ریحانہ جو گاؤں میں میری قریبی سہیلی تھی...... مجھے دیکھ کر اندر آنے کی اجازت مانگ رہی تھی...... گاؤں میں تو بلا جھجھک اندر داخل ہوتے تھے...... آج جیسے انجانے گھر میں آ کر رُک سے گئے...... میں ان کی اس بے رخی پر حیرت زدہ ہوگئی۔ لیکن دل میں ایک فاتحانہ مسکراہٹ چمک اٹھی...... اور اسے اپنی بانہوں میں جکڑ کر اندر کمرے تک کھینچ لائی......

آج مدت کے بعد ہم بغل گیر ہو رہے تھے۔ اگرچہ میں اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی...... ریحانہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑے۔ کچھ دیر تک ہم دونوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا...... ابو اور ماں عبدالرحیم چاچا کے سات باتوں باتوں میں ہی گھل مل گئے تھے...... جمیلہ آج پہلی بار مہمانوں کو دیکھ کر پھولے نہیں سما رہی تھی۔

ابو کی تکلیف کے بارے میں سب گاؤں والے جان چکے تھے اس

واسطے عبدالرحیم چاچا ان کی خبر گیری کے لیے آیا۔ اپنے گاؤں کی اپنایت دیکھ کر میں حیران ہوگئی تھی اور شہر اور گاؤں کی طرز زندگی کا موازنہ کرنے لگی تھی...... وہاں تو جگہ جگہ یادیں بکھری پڑی تھیں۔ یہاں تو اجنبیوں کی زندگی گزر رہے تھے۔

آپس میں باتوں باتوں میں صبح سے شام ہونے والی تھی جاتے جاتے عبدالرحیم چاچا نے ہمارے کھیتوں کے بارے میں بہت متفکر کر دیا تھا...... ہمارے کھیت وہاں سوکھ رہے ہیں۔ بنا پانی کے پیڑ پودے ترس رہے ہیں۔

کھیتوں میں ویرانی چھا گئی تھی۔

''بہت سے فیصلے ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں نہ چاہتے ہوئے بھی وقت کے ہاتھوں میں دینا پڑتا ہے۔'' ......ابو عبدالرحیم چاچا سے برملا بولے......

جب تک انسان صحیح راستوں کا تعین نہ کرے اس وقت تک کسی راستے کا انتخاب کیسے کر سکتا ہے......؟

اب تو اتنے آگے آچکے تھے کہ لوٹ جانا شاید ہمارے اختیار میں نہیں رہا......ہجر کی کیفیت کا احساس لمحہ لمحہ کا دکھ جو اندر ہی اندر ختم تو کرتا ہے لیکن مرنے نہیں دیتا...... یہ غلطیاں تو زندگی بھر پشیمانی کے کرب اور اذیت سے باہر آنے نہ دیتیں۔

اونچی اڑان بھرنے پر تو زمین پر گرنے کا خوف ہمیشہ رہتا ہے......

فرشتے

رات کی تاریکی نے اگرچہ دستک دی تھی لیکن ریلوے اسٹیشن کے اندر کا منظر روشن بلبوں سے جگمگا رہا تھا...... اسٹیشن لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا...... آپس میں الجھتے پھسلتے مسافروں کو پلیٹ فارم تک پہنچنے میں سخت دشواریوں سے گزرنا پڑتا تھا۔

میرا شوہر انور میرا ہاتھ پکڑ کر سہارا دے رہا تھا...... بڑی مشکل سے ہم پلیٹ فارم تک پہنچ گئے تھے...... اتفاقاً ہم ایک خالی جگہ پر بیٹھ گئے تھے...... پتہ چلا کہ اجمیر شریف جانے والی ریل گاڑی ابھی ایک دو گھنٹے لیٹ تھی...... ہمیں بھی اجمیر شریف جانا تھا۔ اس انتظار میں شوہر نے میرا کافی حوصلہ بڑھایا۔ کچھ دیر تک آپس میں باتوں باتوں میں ہی وقت کٹ گیا تھا...... ابھی تک ریل گاڑی کا کوئی بھروسہ نہیں کب سٹیشن پر ٹھہرے گی۔ میں چپ چاپ اٹیچی کے سہارے ٹیک لگا کر آرام کرنے لگی...... اتنی دیر میں میرے شوہر انور بھی کہیں چلے گئے تھے...... مجھ سے بغیر پوچھے ہی...... ہوسکتا ہے کہ انہوں نے جانے کا اشارہ کیا ہو مجھ سے میں نے دھیان نہیں دیا ہوگا...... اصل میں تھکن سے چور تھی میں...... اکیلے پن میں کسی انجانے راستے پر ٹھہر جانا اس کا احساس تو تھا مجھے...... لیکن اس بھیڑ میں تو ذہن میں

انتشار پیدا ہو گیا......

ان کے ہوتے ہوئے ابھی تک کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی لیکن آج اُن کی اس لاپروائی سے میں متفکر ہو رہی تھی میرے دماغ میں عجیب طرح کے خیالات ابھرنے لگے......سوچا اگر ہمت ٹوٹ گئی تو آگے چلنا مشکل ہو جائے گا۔میں نے جلدی سے دماغ کو اس فتور اور فالتو خیالات سے آزاد کیا......سوچا کبھی کبھی ان مراحل سے گزرنا پڑتا ہے......میں نے چپ سادھ لی تھی کہ اچانک ریل گاڑی کے شور سے مسافروں کی بھاگم دوڑ میں آوازیں بلند ہونے لگیں......بہت سارے مسافر جو پلیٹ فارم پر بے ترتیب سوئے پوڑے تھے وہ بھی جاگ گئے تھے......چند منٹوں میں ہی پلیٹ فارم کی دوسری جانب ریل گاڑی پٹری پر چرچراتے ہوئے شور میں آہستہ آہستہ رک گئی تھی......

میری بے چینی اور بڑھ گئی ابھی تک شوہر کا پتہ ہی نہیں وہ کہاں پر ہیں......کسی سے پوچھ کر مطمئن ہو گئی تھی کہ ریل گاڑی اجمیر جانے والی نہیں تھی......وہ ابھی دیر سے آنے والی تھی......اب تو مجھے پیاس بھی لگی......اور گلہ بھی خشک ہو رہا تھا......بیگ میں سے پانی کی بوتل نکال کر ابھی تک ہونٹوں تک ہی لے آئی تھی......دیکھا تو تھوڑی دور میں ایک معصوم خوبصورت بچی میری طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھی پھولوں والا دلکش فراق پہن رکھا تھا......چھوٹی چھوٹی پونیوں میں نہایت پیاری لگ رہی تھی......جی چاہتا تھا اسے اپنی گود میں بٹھالوں جو ایک خوبصورت کلی کے مانند تھی......

یہ دل کے اندر ایک دم ممتا کا کیسا زیر پھیلا گئی تھی جو مجھے تڑپاتا رہا...... وہ مجھے پیار بھری نظروں سے بار بار دیکھ رہی تھی ...... لیکن وہ اتنی چپ چاپ کیوں ہے۔ ہر گزرتے لمحے کا احساس ممتا کے دامن میں سمیٹ کر آ گئی تھی ...... اصل میں ہر بچہ پر میرا دھیان میرا وجود ان کی طرف مائل ہو جاتا تھا...... ہماری شادی کے ساتھ آٹھ سال ہو چکے تھے۔ میری کوکھ سے ابھی تک کوئی اولاد نصیب نہیں ہوئی تھی ...... ہم دونوں کے لیے یہ ایک بہت بڑے المیہ سے کم نہیں تھا...... ممتا کی آس میں اپنے شوہر انور کو اجمیر شریف آنے کے لیے رضامندی ظاہر کی تھی ...... کچھ دیر کے لیے میرا دماغ مفلوج ہو چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا یہ سب ناممکن ہے...... تقدیر سے بھلا کون لڑ پاتا ہے لیکن دل میں اولاد کا غبار چھا رہا تھا......

اس معصوم بچی کو میں عقیدت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی ...... اس کے کومل ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ جاگی اور پھر ڈوب گئی ...... پتہ نہیں یہ معصوم بچی جس کے سہارے پر بیٹھی تھی وہ سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی ...... اس نے اپنا پورا جسم چادر سے ڈھانپ لیا تھا کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہونے لگا تھا یہ بچی اس کی گرفت سے نکلنا چاہتی ہے...... اس کے بے بس چہرے پر جیسے ملال تھا۔ میرے پاس آنے کی جستجو کر رہی تھی میں نے پانی کی بوتل اس کی جانب بڑھا کر اشارہ کیا...... وہ آنے سے کترا رہی تھی ...... ایک بار تو اس معصوم بچی نے اٹھنے کی ہمت کی تھی لیکن وہ اس طرح دبوچ لی

گئی جیسے کوئی کھلونا ہے انسان نہیں میں غور سے اس کی پریشان صورت دیکھنے لگی تھی۔ یہ کیا تعلق کیسا رشتہ! میں تذبذب کی شکار ہوگئی تھی۔ کچھ سو جھائی نہیں دیا...... اپنے دل کو ان رشتوں کے بارے میں سمجھانے کے لیے...... اچانک اس بدگمانی سے باہر نکل آئی شوہر کو سامنے پاکر سٹپٹا سی گئی...... اور سکون کی سانس لی...... تمام فکر و خدشات اگرچہ دور ہو گئے...... دیکھا تو وہ اپنے کئے پر بیزار بھی نہیں ہو رہے تھے جیسے وہ ایک لمحے کے لیے بھی مجھ سے الگ ہوئے ہی نہیں تھے......

''کیا تم ٹھیک ٹھاک ہو؟''

''تم کیا اسی وقت آئے ہو''

''بات کیا ہے...... کس الجھن میں پڑی ہو...... میں تو تمہارے پاس میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا...... مجھے تم پر نظر تھی......'' وہ سچ کو چھپا کر بول رہا تھا...... میں جان گئی تھی۔ لیکن زیادہ دور بھی نہیں گیا ہوگا۔

اب تو مجھے کھانا کھانے کے لیے ضد کر رہا تھا...... میں اس لیے منع کر رہی تھی۔ اس معصوم بچی کے بنا پانی کی ایک بوند بھی گلے سے نہیں اترے گی...... اس کو دیکھتے ہوئے کھانا کیسے کھایا جائے گا......!

دیکھا تو اس وقت وہ بچی بہت رو رہی تھی...... وہ چیخ رہی تھی...... میرے دل میں ایسا درد اٹھا۔ یہ درد تو شوہر سے بانٹنا چاہتی تھی...... سب کچھ سننے کے بعد اس نے ٹال مٹول سے کام لیا...... اور سب باتیں اَن

سنی کر دی...... اُن کی اس لاتعلقی سے میں بے حد افسردہ ہوگئی......سوچا تو میں نے بھی آخر اس کی کیا لگتی ہوں اس معصوم بچی کی......اس کی تو اپنی ماں ہو گی۔ گھر ہوگا۔ پریوار ہوگا...... میں تو صرف ایک عورت ہوں جو کبھی کسی کی ماں نہیں بن سکتی......

میں نے تو اپنے آپ سے شکست کھائی...... پھر بھی نظریں بار بار بچی کی طرف اٹھ رہی تھیں......اس وقت وہ بالکل خاموش ہو چکی تھی......

چند لمحوں کے بعد ایک شخص اُن کے سامنے ایسے پیش آ رہا تھا وہ عورت ایک دم کھڑی ہوگئی۔ اور اس معصوم بچی کو اس کے حوالے کیا اس معصوم بچی کا وہ سر سے پاؤں تک جائزہ لے رہا تھا۔ جیسے بازار میں وہ کسی چیز کی خریداری کر رہا تھا......

کچھ نہ سمجھتے ہوئے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی جرم تو نہیں ہو رہا ہے میرا میرا دماغ بالکل اوٹ ہو گیا......طرح طرح کے خیالات دماغ کو ڈس رہے تھے......اس معصوم چہرے کو میں بھانپ رہی تھی کہ وہ بار بار میری طرف کیوں گھور گھور رہی تھی...... ایک مبہم سا خوف ذہن میں سرائیت کر گیا...... میں لاچار سی کھڑی کی کھڑی رہ گئی کچھ ہی دیر میں یہ عورت جس کے بغل میں وہ معصوم بچی تھی۔ اپنے گندے ہاتھوں میں پھول کو مسل کر روپیوں کو تول رہی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ رفو چکر ہوگئی......اس بات سے بالکل انکار نہیں تھا وہ معصوم بچی بک چکی تھی......

یہ دلخراش سانحہ جس نے میرے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اس سے پہلے میں چیختی چلاتی شوہر نے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا...... اگرچہ وہ بھی اس حقیقت سے واقف ہو چکا تھا......

اچانک اسٹیشن کے اس پلیٹ فارم پر شور وغل بپا ہوا۔ پولیس والوں کی بھاگم دوڑ میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ کچھ ضرور غلط ہو رہا تھا...... سب مسافر سہم کے رہ گئے آخر کیا ماجرا ہے...... جو اس طرح پولیس والوں کی طرف سے کاروائی ہو رہی تھی......

میرے دل میں ایک امید سی جاگی جب میری نظر اس معصوم بچی پر پڑی جو باز کے پنجوں سے آزاد ہوگئی تھی۔ اس شخص نے پولیس کے ڈر سے اسے ایک جگہ چھپا دیا تھا اور خود بھاگ نکلا تھا...... میں نے شوہر کو اس واردات سے آگاہ کیا...... نہ جانے کون سی مجبوری نے ان کے قدموں میں زنجیریں ڈال دیں۔ در اصل اجمیر شریف جانے والی ریل گاڑی کافی دیر سے پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور نکلنے والی تھی...... سب مسافر اپنے ڈبوں میں بیٹھ چکے تھے......

پتہ نہیں کس ارادے سے میں نے اس معصوم بچی کو اپنی گود میں پناہ دی...... کہیں یہ فیصلہ میں نے غلط تو نہیں کیا تھا...... دیکھا تو اس معصوم بچی کے چہرے پر نا قابل فہم مسکراہٹ پھیل گئی جیسے ماں کی آغوش میں شفقت ملی۔

میرے شوہر یہ دیکھ کر ششدر سے رہ گئے ہر چند کہ بہت حد تک قصوروار میں ہی تھی...... اپنے دل پر پتھر رکھ کر شوہر سے سمجھوتہ کرنا پڑا......

اس معصوم بچی کو پولیس کے حوالے کریں گے...... کہیں اس معصوم بچی کو اغوا کرنے کا الزام ہم پر نہ آئے۔

سوچتے سوچتے ہمارا دماغ اتنا مفلوج ہو چکا تھا کہ خیال بھی نہ رہا ریل کافی دور نکل چکی تھی اپنی منزل کی جانب......

ان الجھنوں سے نکل کر دل کے اندر سرشاری کی لہر دوڑ گئی تھی ......شوہر کے نیک ارادے سے یہ بات سامنے آئی کہ اجمیر شریف پہنچتے ہی پولیس اسٹیشن جائیں گے۔ اور اس معصوم بچی کو ان کے حوالے کریں گے......اگر ممکن ہوا تو جب تک اس بچی کی اصلی ماں نہیں ملتی۔ تب تک ہم اس بچی کو گود لیں گے ہو سکتا ہے وہ مان بھی جائیں گے...... آخر کب تک وہ اس معصوم بچی کو اپنے پاس رکھ سکیں گے......

واقعی شوہر نے میرے مردہ دل میں زندگی کی حرارت پیدا کر کے خوشیوں سے بھر دیا تھا......

میں نے اس بچی کو گود میں بٹھا کر چادر سے اوڑھ لیا تھا اس سے کسی کی نظر نہ لگے......

کافی رات ہو چکی تھی...... یہ بچی ابھی تک گہری نیند سو رہی تھی......ہو سکتا ہے اسے بے ہوشی کی دوا پلائی گئی ہو اس طرح کے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں...... مجھے تو اس وقت اس کی اپنی ماں کی لاچار نظریں دکھائی دیتی تھیں۔ اس کا تڑپنا، سسکنا یاد آتا ہے۔ جی چاہتا تھا ان مجرموں

سے انتقام لوں...... کسی طرح یہ لوگ ماں کے کلیجے پر برائے راست وار

کرتے ہیں بناڈر اور خوف کے......

اسی پریشانی اور الجھن میں ڈوبے ہوئے کتنی دیر یونہی سوچتے

گزاری تھی...... ہر گزرے لمحے کا احساس ممتا کے دامن میں سمیٹ کر

خوشیاں لا رہا تھا...... وہ ممتا کا احساس جو کبھی میرے دل میں نہیں جاگا تھا

آج بار بار اسے دیکھ کر پارے کی طرح مچلنے لگا تھا۔

یہ بچی کھیلتے کھیلتے بچپن سے جوان ہوگئی تھی ایک کلی پھول کے مانند

کھل اٹھی۔ طرح طرح کے بھنور سے اس کے ارد گرد منڈلانے لگے

تھے...... ایسا لگا جیسے جوانی کی دہلیز پر پہنچتے ہی میرے ہاتھوں سے نکل چکی

تھی میں زور سے چلائی۔ خوابوں کی دنیا سے نکلتے ہی شوہر نے مجھے

سنبھالا...... اور اس بچی نے بھی ہچکیوں کے درمیان آنکھیں کھول دیں......

اب جبکہ منزل قریب نظر آنے لگی تھی...... ہجر کی کیفیت محسوس

ہونے لگی تھی اور سوچتی ہوں کیا میں اس طرح صلیب کندھوں پر اٹھائے

چلوں...... بیہودہ سا ڈر لگنے لگا تھا......

ریل گاڑی نے اپنی منزل پر بریک لگا دی تھی۔ میں نے بچی کے

چہرے سے چادر ہٹا دی تھی...... جونہی اس نے مجھے دیکھا...... اس کا چہرہ

پھول کے مانند کھل اٹھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ بچی کافی سمجھدار ہے......

اچھے برے کی پہچان ہے اس میں...... لیکن پنجرے میں قید تھی اس پرندے

کی مانند جس کے پر کاٹ دیے گئے ہوں......

سب مسافر اپنی اپنی منزل کی جانب جا چکے تھے......ہمیں اپنی منزل دکھائی نہیں دے رہی تھی......سوچا گناہ اور ہوس اسی دل کی پیداوار ہے......جس میں پھول نہیں کھلتے ہیں۔

اب سٹیشن سے نکلتے ہی ہم آٹو میں بیٹھ کر سیدھے پولیس اسٹیشن کی طرف جانکلے تھے......میری آنکھیں کسی امید کی پناہ ڈھونڈ رہی تھیں......میں بار بار معصوم بچی کے رخساروں کو چھو رہی تھی۔

کچھ ہی منٹوں میں آٹو پولیس اسٹیشن کے گیٹ کے سامنے رک گیا تھا ہم نیچے اترتے ہی اندر داخل ہو گئے......دیکھا تو ایک عورت اپنی بچی کے گم ہونے کے بارے میں پولیس والوں سے التجا کر رہی تھی۔ان کے پاؤں پڑ رہی تھی......ایک دم میں بت بن کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی......میری گود سے یہ بچی نکل چکی تھی......اور زور زور سے چلانے لگی تھی ممی، ممی کہہ کر وہ اس عورت سے لپٹ گئی تھی جو اس کی اصلی ماں تھی......

سب پولیس والے ہکا بکا رہ گئے تھے......

یہ سارا ماجرا سن کر ڈھیروں آنسو اس ماں کے پلکوں کا بند توڑ کر گالوں پر ڈھلک آئے......

”تم کون سی دنیا کی مخلوق ہو؟ زمین سے آئے ہو یا آسمان سے اترے ہوئے فرشتے ہو......وہ بولتی رہی۔ بولتی رہی......بولتی رہی......“

آندھی اور چراغ

آئینے کے سامنے پہلی بار دلہن کے روپ میں اپنے آپ کو سجائے سنوارے دیکھ رہی تھی...... کیا واقعی دلہن اتنی خوبصورت اور حسین لگتی ہے...... ذرق برق پہناوا آسمان سے اتری ہوئی حور کا گمان ہوتا ہے...... بار بار ائینہ کو دیکھ کر اس کے دل کا حال چہرے سے عیاں ہو رہا تھا جو پھول کی مانند شبنم کے قطروں میں نہلا کر سر پر سرخ رنگ کی چادر اوڑھ کر نگاہیں حیاء سے جھکائی ہوئے تھی...... کہیں خود کو اپنی نظر نہ لگ جائے۔

میرے چہرے پر لطیف سا حجاب پھیل چکا تھا...... جس گاؤں میں اب یہ میری زندگی پروان چڑنی تھی وہاں اس حجاب کی اہمیت سے میں بالکل ناواقف تھی......

آج جو میری شادی ہو رہی تھی...... شہر کو چھوڑ کر گاؤں میں دل کے ارمان جگانے جا رہی تھی...... بچپن سے لے کر جوانی کی دہلیز تک پہنچ کر زندگی خوشیوں اور امنگوں کے ساتھ گزاری تھی...... اگر چہ میرے موڈ میں خوشگوار تبدیلی واضح تھی...... لیکن ذہنی کیفیت سے لاعلم بھی نہیں رہی تھی...... کسی خوش فہمی کے خوابوں سے نکل کر تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنا ابھی باقی تھا...... لیکن اپنے عزم واعتماد سے انسان چاہے تو زندگی کی نئی راہیں

خوش اسلوبی سے تلاش کرسکتا ہے.....عورت تو ہمیشہ اپنی محبتوں کی خاطر قربانی دیتی آئی ہے......

اب جو میری رخصتی کا وقت تھا.....سب لوگ میرا انتظار کررہے تھے.....سہیلیاں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے چکر میں مجھے کھینچ لائیں.....سبھی مہمان گیٹ پر کھڑے ہو کر بے چین ہورہے تھے..... مجھے دیکھنے کے لیے.....ایک جانب تو اپنے پرائے ہو جانے کے غم میں آنسو بہاتے جارہے تھے.....رنگین چمکتے دمکتے چہرے نم ہورہے تھے.....میری ماں رورو کے نڈھال ہورہی تھی......

یہ بات بیٹیوں کے رشتوں میں ہوتی ہے جو انہیں پست کردیتی ہے......

یہ دنیا کا اصول ہی ایسا بنا دیا گیا ہے جہاں بیج بوتے ہیں۔وہاں پودا تو ضرور اُگتا ہے۔لیکن وہ پودا دوسری جگہ لگانے سے پھل دیتا ہے.....وہی زندگی خوشحالی سے ہمکنار ہوتی ہے۔جو دوسروں کے لیے ہو.....اگر ایک عورت کو امید کی نئی کرن نظر آتی ہے.....لیکن دوسری جانب اپنوں سے بچھڑنے کا غم دل کو کرید کر رکھ دیتا ہے.....اب تو نئی زندگی کا آغاز دل کی ساری کدورتوں کو بھلا کر نیک خواہشات کے ساتھ قدم جمانے ہوں گے......

سسرال پہنچتے ہی میں طرح طرح کے خیالوں سے بالکل بری

ہو چکی تھی ...... سوچوں سے دامن چھڑا کر نئے چوکھٹ پر قدم رکھتے ہی دل خوشیوں سے بھر گیا تھا...... ننھے ننھے برقی قمقموں سے سارا گھر جگمگا رہا تھا...... ہر طرف رنگین اور خوبصورت لباسوں میں ملبوس چھوٹی چھوٹی ننھی منی پیاری بچیاں خوشیوں میں لہرا رہی تھیں۔لڑکے بھی کسی سے کم نہیں تھے...... عورتیں گانا گانے میں مصروف تھیں...... چنچل لڑکیاں شرارت کرنے میں باز نہیں آتیں تھیں...... ایک ایک سے گلے ملتے اندر تک آئی تھی...... گمان ہوتا تھا یہ شہر ہے یا گاؤں۔کمرہ پھولوں سے سجایا گیا تھا...... ہر طرف روشنیوں کے اجالے بکھیر دیے گئے تھے...... زندگی کی ایسی یادیں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ شادی کتنا مقدس بندھن ہے جس میں خلوص اور صداقت کا جذبہ پنہاں ہوتا ہے......

یوں شادی کی خوبصورت راتیں، چاہتوں اور وعدوں کو باندھنے میں گزار دی تھیں میرے شوہر امتیاز نے اپنی محبت اور شفقت سے اپنے گھر سے میری شناخت کرادی......

وقت اپنی رفتار سے گزرنے لگا تھا...... پتہ نہیں چلا کس طرح وقت نے کروٹ بدلی...... اپنوں سے بچھڑ کر ایک نئی زندگی کے راستے تلاش کرنے لگی تھی...... جہاں نئے لوگ نئے ہمسفر ملے تھے......

دو چھوٹی چھوٹی نندوں افروزہ اور گلشن سے ڈیر سارا پیار ملا وہ آٹھویں اور دسویں جماعت کی طلاب تھیں۔

یہاں تو اب میں امیدوں کے چراغ جلائے بیٹھی تھی...... میں نے پوری امید کے ساتھ اور نیک خواہشات میں اس گھر کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کیا...... لیکن بہت جلد اس غلط فہمی میں نروس ہو گئی تھی...... پھر سے جب یونیورسٹی جانا شروع کر دیا تھا......

امتیاز اور میں دونوں یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ وہی ہمارا میل جول بڑھا...... اس سے پہلے کہ ہم عشق و محبت میں دنیا کی نظروں سے گر جاتے...... زندگی کو اگر روشن کرنا تھا اور حیات کو برقرار رکھنا تھا تو غیر ضروری باتوں سے پرہیز کرنا پڑا تھا۔ اس واسطے ہم دونوں نے شادی کے لیے رضامندی ظاہر کی تھی...... بغیر کسی اڑچن یا دشواری سے ایک پروقار طریقے سے یہ شادی انجام پائی تھی......

اگرچہ ساسو ماں کے ساتھ گھر کے کام کاج میں جٹ گئی تھی...... لیکن امتیاز کے ابّا میرے سسر کو میں نے کئی بار ابّا کے نام سے پکارنے کی کوشش کی انہوں نے کبھی بھی میری بات کو دھیان نہیں دیا...... وہ ہمیشہ مجھ سے دور رہے مجھ سے کبھی بات کرنا گوارا نہیں سمجھا...... سوچا ہو سکتا ہے وہ اپنے کام سے زیادہ مصروف رہتے ہوں گے...... سنا تھا ان کے یہاں اچھی کھیتی باڑی، باغ بغیچے۔ اس گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی...... اور ان مصروفیات کے باوجود بھی وہ بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے میں کبھی پیچھے نہ رہے تھے۔

پھر یہ میرے سینے میں ایسا درد کیوں...... مجھ سے نہ صحیح اپنی اولاد کی خاطر لاتعلقی کا مجھ سے اظہار کرنا یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی...... مجھے تو ان کی جانب سے اپنی زندگی بے حقیقت لگنے لگی تھی......

اس شکایت کو میں نے کبھی بھی ذہن میں جگہ نہیں دی...... ہمیشہ بلند حوصلوں کے ساتھ اس گھر میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ بار باران کے سامنے گزرنے کی کوشش کر رہی تھی...... ہر بار اس اعتبار سے دھوکے میں رہی تھی......

یونیورسٹی میں ہمارا آخری سال چل رہا تھا...... پڑھائی کے ساتھ ساتھ گھر گرہستی کا بھی خیال رکھنا ضروری تھا...... ذراسی لاپروائی سے گھر کا سارا ماحول بگڑ جائے گا...... کیونکہ اکثر بہوویں اس کی ذمہ دار ہوتی ہیں اور اس طرح اس کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑے گا......

میں نے تو اس گھر میں مان بڑھانے کی پوری کوشش کی...... اس سے پہلے کہ میں خود سسرابا سے بات کرتی...... وہ کچھ بدلے بدلے سے دکھائی دینے لگے تھے...... ان کی اس لاتعلقی سے پریوار کے سامنے شرمندہ ہونا پڑتا تھا......

اس گھر میں دکھ سکھ کا کھیل ثابت ہو رہا تھا...... وقتی طور پر اگرچہ میں خاموش ہوگئی تھی...... لیکن ہوا بالکل اس سوچ کے برعکس تھی......

ساسوماں کے سامنے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے بات نکل ہی گئی

تھی...... کہ سسر ابّا مجھے بالکل پسند نہیں کرتا...... یہاں میں جیسے فالتو فرد سے رہ رہی ہوں...... یا غیر ضروری چیز ہوں۔ جسے کبھی بھی باہر پھینکا جا سکتا ہے...... میری یہاں خاص کر اس گھر میں بڑوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے......

میں تو پورے خلوص اور سچے دل سے آپ لوگوں کی پناہ میں آئی تھی...... اب تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنا مجھ میں وہ ہمت نہیں رہی...... فیصلہ تو آپ کو بھی کرنا ہے۔ کیونکہ ساسو ماں اپنی ماں کے برابر ہوتی ہے......

میں اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو روک نہ سکی...... ساسو ماں میری لاچارگی پر بہت تڑپ گئی تھی وہ دم بخود ہو کے رہ گئی تھی......

یہ ایک عورت کے لیے کتنی بد نصیبی ہے۔ ایک دکھ ختم نہیں ہوتا دوسرا غم شروع ہوتا ہے...... میں اُن پر چھایا ہوا غبار ہٹا کر ان کو کوتاہیوں کا احساس دلانا چاہتی تھی۔ کیونکہ وہ بھی میری طرح بے حال ہو گئی تھی...... لیکن انہوں نے خاموشی توڑ کر تسلی اور دلاسوں میں مجھے زندگی کی طرف آنے میں مجبور کر دیا تھا...... اور حوصلہ بڑھایا مجھے۔

سچ تو یہ تھا کہ سسر ابا کے فتور کی وجہ سے خوف کھائے جا رہا تھا کہ بیٹے نے اپنی مرضی سے شادی کر لی ہے...... اور وہ بھی ایک شہری لڑکی سے۔ جو گاؤں کے طور طریقوں سے بالکل ناواقف تھی...... یہ کیسے ممکن تھا کہ شہر کی رنگینیوں میں کھو جانے والی لڑکی گاؤں میں رہ کر اپنے آپ کو ایڈجسٹ

کر سکتی تھی......اکثر دیکھنے میں آیا تھا کہ ایسی بہت ساری لڑکیاں شادی کے بعد اپنے شوہروں کے ساتھ جگہ اور گھر بدلنے میں دیر نہیں لگاتی ہیں ......شاید میرے شوہر دوسروں کے ساتھ امتیاز کا موازنہ کرنا بالکل غلط تھا......لیکن سسر ابا اس خوف سے باہر نہیں نکل رہے تھے......اس بات سے بھی انکار نہیں ہے کہ بچہ بچپن سے جوانی کی دہلیز تک ایک محتاط زندگی گزرتا ہے......لیکن شادی ہونے کے بعد وہ سب کچھ بھول کر رنگین دنیا میں آکر اُسے کچھ بھی یاد نہیں رہتا......

میں تو سن کر دلیر بن گئی تھی......گزرتے وقت کے ساتھ اگرچہ میں نے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ دل میں ایک اور درد اٹھا......آج صبح ہی امتیاز اپنے باپ سے تلخ کلامی کر گیا تھا......شاید انہوں نے میرے بارے میں سب کچھ سنا ہوگا۔ رات گئے تک وہ گھر لوٹ کے نہیں آئے تھے......

موسم میں بھی آج تناؤ تھا...... چاروں اور اندھیرا چھایا رہا تیز ہواؤں کے جھونکے لہرا رہے تھے......میں نے گھر کے سارے دروازے کھڑکیاں بند کر دیں تھیں......امتیاز کی فکر سب کو ستا رہی تھی۔ آندھی اور طوفان کا زور بڑھتا جا رہا تھا......بجلی کا کوئی نام و نشان نہیں تھا...... ہر طرف شور و غل سنائی دے رہا تھا...... بچے سہم کے رہ گئے تھے......ہمت کر کے میں نے چراغ جلا ڈالے گھر کے اندھیروں کو روشن کیا......سب کے چہروں پر رونق آگئی۔

سسرابا میری طرف پشیمان نظروں سے دیکھ رہے تھے......ساسو ماں نے اطمینان کی سانس لی وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی......

میں نے ان سے کہا اندھیروں سے خوف کھا کر چراغ کبھی بجھتے نہیں......



بے نور آنکھیں

میری بیٹی صبیحہ حسب عادت نیند سے جاگتے ہی نہا دھو کر سب سے پہلے برآمدے میں لگے ہوئے گلدستوں کو سنوارتی، سجاتی اور تازہ پانی سے ان کو نہلاتی ہوئی خود کو بھی تازہ محسوس کرتی تھی وہ کھوئی ہوئی سی خاموشی کے ساتھ پھولوں سے باتیں کرتی رہتی تھی......شوخ نگاہوں سے لال، پیلے، نیلے، بنفشی اور سفید پھولوں کے رنگ میں خود کو رنگ دیتی تھی۔ جب تتلیاں ان پھولوں کا رس چوسنے کے لیے ان پر منڈلاتیں پھرتیں تھیں۔ وہ اُن کو پکڑنے میں الجھ جاتی تھی......ابھی جیسے اس کا بچپنا نہیں گیا تھا......بچپن کا دور تو زندگی کا خوبصورت ترین دور گذرتا ہے......گزرتے لمحے اب خواب بن کر رہ گئے تھے......اب تو وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی......اسکول سے نکل کر کالج میں داخل ہو چکی تھی......اب تو پڑھائی کے ساتھ ساتھ گرہستی کا کام بھی سنبھالنا پڑتا تھا......کیونکہ وہ میری اکلوتی بیٹی ہے......وہ دو بھائیوں میں منجھلی والی ہے......ایک چھوٹا بھائی ریاض اور دوسرا صبیحہ سے بڑا ارشد......سب کے پیار و محبت میں سرشار لگتی ہے......ان کے اس رویے اور شفقت سے ماں باپ کے لیے سب سے بڑا تحفہ کیا ہو سکتا ہے......ان کے آپس کی پیار و محبت میں کبھی کبھار نوک جھونک لڑنے جھگڑنے کی وجہ سے کبھی

وہ رونے پر آجاتے...... تب مجھے ہی سنبھالا نا پڑتا ہے۔ اولاد کی خاطر ماں باپ کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔ ان دھندلی آنکھوں سے روشنیوں کا جگانا پڑتا ہے۔ انسان کے مقدر میں بہت ساری سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں اپنی اولاد کی خاطر...... جس طرح شبنم کے قطرے پھولوں کو تازگی بخشتے ہیں اسی طرح ماں باپ کے آنسوؤں سے بچوں کی زندگی کی عمارت کھڑی ہو جاتی ہے...... تب بچوں کی شخصیت میں وقار پیدا ہوتا ہے۔ خدانخواستہ ذراسی لاپروائی سے بچے غصیلے بن جاتے ہیں۔ لیکن حالات بہت دنوں سے خراب رہے۔ خوف و دہشت کا ماحول رہا...... جیسے دوبارہ پوری وادی ایک بار پھر اس کی لپیٹ میں آگئی ہو جنہیں برسوں میں سہتے آئے ہیں...... اب تو ان کا غصیلے بن جانا حق بجانب ہے...... یہ نہ تھمنے والا سلسلہ بچوں پر اثر انداز ہوتا ہے...... جدھر بھی دیکھیں قیامت سے کم نہیں گھر کے اندر یا گھر سے باہر کوئی بھی شخص محفوظ نہیں...... عجیب طرح کی اداسی اور ویرانی پھیلی ہوئی ہے......

قدرے سنبھل سنبھل کر میرے شوہر اقبال اور بڑا بیٹا ارشد تجارت کی امیدوں پر وابستہ ہیں...... سب کچھ حالات، خواہشات اور امیدیں حقیقت سے بہت دور ہیں......

شہر ہو یا گاؤں ہر لمحے دل دہلانے والی چیخیں دہشت سے کم نہیں...... کب کس کا جنازہ اٹھے کوئی اندازہ نہیں بارود اور گولیوں کے بیچ میں زندگی محفوظ نہ رہی...... ایسا لگتا ہے سیاہ گھٹاؤں کے ہوتے ہوئے آسمان

بھی کھل کر نظر نہیں آتا......

بچوں کا زیاں کا احساس دکھ بن کر وجود کے ہر حصے پر حملہ کر دیتا ہے۔ کیونکہ ہر گلی ہر نکڑ پر پولیس کا پہرہ بٹھا دیا گیا ہے بچے پنجرے میں پرندوں کی طرح ہو گئے اور یہ عذاب بچوں کی بدولت ماں باپ پر بھی مسلط ہونے لگا ہے......زندگی ایک وحشت سے کم نہیں دکھائی دے رہی ہے......قدم اٹھانے سے پہلے کوئی یہ نہیں سوچتا ہے کہ راستہ کدھر کو جاتا ہے پتہ نہیں پھر بھی انسان کس امید پر جینا چاہتا ہے......زندگی کی راہیں تلاش کرنے میں......یہ وہی لوگ ہیں جو اذیت و مشکلات کا مقابلہ نہایت استقامت سے انجام دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جو آسان بھی نہ تھا لیکن یہ کرنے جا رہے ہیں......اس طرح پیشہ ورانہ صلاحیتوں والے لوگوں میں بھی ایک ٹھہراؤ سا آ گیا اور روز بروز ہر طبقے کے لوگوں کو بھی اس اضطرابی لہر سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اب کوئی معجزہ ہی اندوناک حالت سے ان کو بچا سکتا ہے......غصے کی کیفیت میں لوگوں کو مشتعل ہونا فکر و تشویش ہونا برملا ہے تعلیم پر تو بہت برا اثر پڑ رہا تھا باوجود یہ کہ ہر طالب علم اپنی منزل کے تعین کے لیے کسی مناسب وقت کے انتظار میں زندگی کے خوبصورت خواب بنے ہوئے تھا......جس مسکراہٹ میں بچے سکول یا کالج کی جانب بڑھ رہے ہیں کیا وہی مسکراہٹ لے کر شام کو گھر صحیح سلامت لوٹ کر واپس آئیں گے۔ کوئی گارنٹی نہیں......

سپاہیوں کا جال ایسا بچھایا گیا گویا مکھی اور مکڑے کا کھیل شروع ہو چکا تھا......ان حالات کی وجہ سے کوئی بھی ماں باپ بچوں کو اسکول یا کالج بھیجنے کے لیے رِسک نہیں لے سکتا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی طالب علم پڑھائی سے منحرف نہیں ہونا چاہتا تھا......میری بیٹی صبحیہ تو ان طلاب سے آگے تھی......وہ کالج کا ایک دن بھی ضائع ہونے نہیں دیتی۔

یہ تو عمر کی ایسی سٹیج ہے جہاں خواہشوں اور امنگوں کی روشنیوں کے چراغ جلتے نظر آرہے ہیں......

اب تو دیکھنے اور سننے میں یہ عادت سی بن گئی تھی سپاہی نے دورازہ کھولا......ماں کے سامنے اس کے لختِ جگر کو باہر گھسیٹ لیا......منہ پر کالی پٹی باندھ کر گاڑی میں بٹھا کر رفو چکر ہو گئے......ماں دیکھتے ہی رہ جاتی۔ صرف اس لختِ جگر کی چیخ وپکار سنائی دے رہی تھی......

سوچوں سے دامن چھڑا کر بھی ذہن میں ایسا دلخراش سانحہ گھوم جاتا ہے......راتوں کو بے سکونی کا احساس یہ یاد دلاتا آنے والا دن کسی لاچار ماں کی گود سے کوئی اولاد چھین کر نہ لے جائے......

گزرتے وقت کے ساتھ دل ودماغ پر غبار سا چھایا رہا...... ہر لمحہ لوگوں کا ذہن دھماکوں کی زد میں آ گیا تھا......لوگ کس قدر ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں محض اپنی جان بچانے کے لیے......گھر کے اندر بھی مبہم سا خوف جو پل پل اپنی لاچاری پر آنسو بہانے پر مجبور کرتا ہے......کچھ سجھائی نہیں دے

رہا تھا......

اندھیرے میں ڈوبا ہوا گھر جہاں در اور دریچے کھلنے کا نام نہیں لیتے ایسا لگتا ہے چراغوں کی روشنیوں اور سورج کی کرنوں پر بھی پہرہ بٹھا دیا گیا......اب تو ان گھروں میں رشتوں کا طلسم بھی ٹوٹ گیا تھا......ان رشتوں ناطوں کے ساتھ رہی سہی امیدیں دم توڑ گئیں۔ وقت کے ساتھ انسان تو کیا۔ جانور بھی محفوظ نہ رہے فضاؤں اور پیڑ پودوں کی شاخوں پر پرندے بارود کے قہر سے نہ جانے کہاں کہاں چھپ گئے......مہاجر پرندے اور ابابیلیں واپس لوٹ کر نہیں آ رہے ہیں۔

وقت اپنی رفتار سے گزرنے لگا۔ موسم بدلتے رہے۔ اگرچہ زندگی زیادہ دکھوں کا گھر ہے......کبھی کبھی خوشی بھی جھانکتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے اب کے موسم میں کچھ حالات بہتر ہو گئے تھے......لوگ کام کاج میں جٹ گئے تھے......مگر کاروبار سنبھالنا دردسر سے کم نہیں بہت دقت ہوتی ہے پھر سے کاروبار جمانے کے لیے آخر کتنی بار قسمت دروازے پر دستک دے سکتی ہے......اگرچہ لوگوں کے چہروں پر نا قابل فہم مسکراہٹ پھیل چکی تھی لیکن اس جرم بے گناہی اور بربریت سے زبان کھولنے سے قاصر رہے تھے......اور ظلم کو سہنا اب نا قابل برداشت ہو رہا تھا......لوگ سوچنے پر مجبور تھے ہر مرض کی دوا ضرور ہوتی ہے......کب تک بے غیرتی کا لبادہ اوڑھ کر چین کی سانس لیں......

بچوں کی پڑھائی کے شوق کے پیش نظر ماحول کو قبول کرنا پڑا اب تو اسکولوں اور کالجوں میں تدریسی کام جزوی طور شروع ہو چکا تھا...... اکثر مائیں گھر کے دروزے کی چوکھٹ پر بچوں کے انتظار میں کھڑی رہتی تھیں...... جب تک وہ گھر ہیں پہنچتے تھے اولاد کا غم تو ماں کو قبر میں بھی چین نہیں لینے دیتا......

میں تو امید بھری نظروں سے صبیحہ کو دیکھ رہی تھی...... کالج جانے سے اس کا موڈ انتہائی خوشگوار رہا...... وہ پڑھائی سے مطمئن نظر آ رہی تھی...... گھر واپس لوٹتے ہی گھر کے کام کاج میں لگ جاتی تھی...... یہ میری جسمانی کمزوری یا میری لاپروائی سے ایک طرف اس کی پڑھائی اور پھر گھر کا سارا بوجھ ان کے کاندھوں پر اس کم عمری میں بہت زیادتی ہے۔

لیکن اب تو اس کا بارہویں جماعت کا امتحان نزدیک آ رہا تھا اس کی فکر سے میں واقف ہو چکی تھی۔ یہ سوچ سوچ کر میں مزید پریشان ہوئے جا رہی تھی کہ دل میں ایک امید سی جاگی...... میرے بیٹے ارشد کی شادی ہو جائے یہ ساری الجھنیں اور فکریں دور ہو جائیں گی...... ارشد کی منگنی بہت پہلے ہو چکی تھی لیکن شادی اس لیے نہیں ہو پا رہی تھی حالات کی وجہ...... کتنی ہی شادیاں گاؤں شہر میں منسوخ کرنی پڑیں...... کئی ایسے واقعات بھی رونما ہوئے زندگی کرب سے باہر نہیں نکل پاتی تھی۔ ہر ماں باپ کا کلیجہ دہل جاتا تھا...... جب شادی کے مقدس رشتے کے دوران کتنے ہی دلہا پولیس کے

بھینٹ چڑھ گئے تھے ان میں بہت سارے نوجوان غائب ہو گئے۔ کچھ پتہ نہیں زندہ ہیں یا بے نام قبروں میں گم ہو گئے اس بہانے شادی کرنے سے انکار کر رہا تھا......

لیکن آج اپنی بہن صبیحہ کی بدولت ان کی خاطر شادی کے لیے رضامندی ظاہر کی تھی......تا کہ گھر کا سارا بوجھ جو صبیحہ کے کاندھوں پر تھا۔ کچھ ہلکا ہو جائے اور امتحان کی تیاری بھی اچھی طرح سے ہو جائے......

اس طرح سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں جٹ گئے شادی کی مکمل تیاری ہو چکی تھی...... پاس پڑوس اس خوشی کی تقریب میں ہاتھ بٹانے آنے لگے تھے......

گھر میں خوشیاں بکھر گئیں......شادی کے انتظار میں عجیب سی لذت محسوس ہو رہی تھی...... جب رشتہ داروں نے بھی آنا جانا شروع کیا تھا......وقت تو کسی کے اختیار میں نہیں ہوتا کس وقت کیا ہونے والا تھا...... یہ کسی کے بس میں نہیں تھا۔ گھر اتنا جگمگا رہا تھا۔ کہ آنے والے طوفان کا اندازہ بھی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ ایسی ڈراونی صورت اختیار کرے گا کہ سنبھلنا مشکل ہو جائے گا......

حسب معمول سب گھر کے کام کاج میں مشغول تھے صبیحہ بر آمدے پر پھولوں کو سجا رہی تھی۔ ان کو تازہ پانی سے نہلاتی تھی...... ایک دم سے چیخنے چلانے کی آوازیں چاروں طرف گونجنے لگی تھی......شوروغل

میں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا...... کیا ہونے والا تھا......؟ میں اپنے پریوار کو ڈھونڈنے لگی تھی۔ جو اس وقت گھر سے باہر تھے...... صبیحہ بالکل نڈھال سی ہوگئی تھی...... وہ دروازے کے چوکھٹ پر انتظار کرنے لگی تھی...... میں صبیحہ کو اندر آنے کی ضد کر رہی تھی......

یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ لاشوں کا اَن گنت نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا...... کچھ تو تھا...... گولیوں سے بدتر آوازیں انسان کے روم روم میں آگ بھڑکا رہی تھیں...... وحشتوں نے بے قابو کردیا تھا جب پیلٹ گنوں کے چھروں سے بچوں کی آنکھیں بے نور ہوگئیں......

کچھ ہی دیر میں جو صبیحہ برآمدے پر کھڑی تھی انتظار میں تھی۔ ایک دم سے چیخ اُٹھی۔ دیکھا تو ان کی دونوں آنکھوں سے خون بہہ رہا تھا...... پیلٹ گن کے چھروں سے اس کی دونوں آنکھیں زخمی ہو چکی تھیں وہ اب کبھی دیکھ نہیں پائے گی وہ اب پھولوں پر منڈلانے والی تتلیاں نہیں دیکھ پائے گی جن کے ساتھ وہ کھیل میں مصروف رہتی تھی۔

یہ میری زندگی کی روح پر داغ لگ گیا تھا شاید کرب اور اذیت کا وہ کہاں چلی گئی۔ میں اب تک اُسے ڈھونڈ رہی ہوں مجھے بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے......



بلاعنوان

آج پہلی بار ساسو ماں کے سامنے میری زبان کھل گئی تھی......جنونی انداز میں کیا کچھ بول گئی تھی......خود بھی نہ سمجھ پائی میں التجا میں سمٹی ہوئی تھی یا غصے کی انتہا میں......ان کی خاموشی نے مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ضرور اس وقت ان کی خاموشی میں چنگاریوں میں بھوس ڈالنے کی دیر تھی......لیکن وہ بغیر کچھ کہے میرے سامنے سے چلی گئی تھی......میں خاموش تماشائی بن کے رہ گئی تھی......کچھ دیر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے میں کچن میں چلی گئی تھی......اور کھانا پکانے لگی تھی۔لیکن ایک مبہم سا خوف ذہن میں گھر کر گیا تھا۔کئی دنوں سے ساسو ماں کھانا بنانے میں کچھ نہ کچھ نقص ضرور نکالتی رہتی تھی......ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ کبھی سبزی میں مرچ زیادہ......کبھی سبزی میں نمک کم......کچھ بھی بولتی رہتی تھی......اس ڈانٹ سے ڈھیر سارے آنسوؤں کو پی لیتی تھی......ویسے وہ مجھ سے غیر جیسا سلوک بھی نہیں کرتی اور اپناتی بھی نہیں اس لیے کہ جب سے میرے شوہر انور نے کسی بدگمانی میں مجھ سے آنکھیں پھیر لیں......یہ دیکھ کر ساسو ماں نے رنگ پکڑ لیا......ایسی عورت اس معاملے میں دیر نہیں کرتی......اس وجہ سے وہ میری دشمن بن گئی تھی......اور میرے ساتھ نئے نئے حربے استعمال کرنے لگی......یہ میری بدقسمتی سے

تھی۔

شوہر تو حد درجہ میرے ساتھ لاتعلقی کا اظہار کرنے لگا تھا......نظر اٹھا کر بھی دیکھنا گوارہ نہ تھا......

میں نے سب کے لیے ناشتہ تیار کرلیا تھا۔اب پتہ نہیں نمک زیادہ ہوگیا یا کم......دشمن کی محبت تو ان کے سامنے تھی...... پورا پریوار چپ چاپ کھانے میں مصروف تھا...... پریوار بھی کتنا ایک سسر اقبال صاحب، ساسوماں، ایک جوان سال نند اور میرے شوہر انور......سب کے چہروں پر میرے بارے میں ایک عجیب سا جنون تھا......اگرچہ ان کے ساتھ میں نے بھی ناشتہ کیا......کچھ دیر تک میں سوچوں میں ڈوبی جارہی تھی......ایک امید نے مجھے جگا دیا تھا......کسی خوش فہمی میں اٹھ کر باہر چلی گئی تھی......شاید شوہر آفس جاتے جاتے مجھ سے کچھ بولے......کتنی خوش اور سرشار ہوتی ہیں وہ عورتیں جن کے شوہر آپس میں آنکھیں ملاتے ہوئے کہیں جاتے ہیں...... یہ احساس کتنا پیاسا اور کتنا آرزومند ہوتا ہے......لیکن انہوں نے نظریں اٹھا کر بھی میری طرف نہیں دیکھا......

میری شادی کو سال ڈیڑھ سال گزر چکا تھا یہ جانتے ہوئے کہ عورت کو دو مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے پہلی منزل ماں کی گود میں دوسری منزل سسرال میں...... یہ طے ہے کہ دوسری منزل وہ بڑے اطمینان کے ساتھ قبول کرلیتی ہے......اس کی دائمی حفاظت شوہر کے ساتھ منسلک

ہے......

سسرال میں ایک نہایت شاندار زندگی کا آغاز ہوتا ہے......سچ تو یہ ہے کہ اپنوں کو بھول کر غیروں کے ساتھ رشتہ جوڑ کر اپنا مان بڑھاتی ہے......سلگتے ہوئے غموں کے لاوے نیک تمناؤں سے بجھا دیتی ہے......

اب تو میں بیٹی سے بہو بن چکی تھی یہ نام تو گرہستی بنانے کی شہہ پاتا ہے......شروع سے ہی میں ساسوماں کی بہت عزت کرتی رہی۔ اور سسر اقبال صاحب اور نند کے ساتھ بھی میرا اچھا برتاؤ رہا......

اب تو عجیب سی کیفیت میں مبتلا رہی تھی......وہ مجھے غیر بھی نہیں سمجھتے اور اپناتے بھی نہیں۔ شوہر نے مجھے بالکل تنہا چھوڑ دیا تھا......میں ان کی بیوی ہوتے ہوئے بھی سچائیوں کا سامنا نہیں کرتی تھی......

ایک پڑھا لکھا باشعور انسان ہو کر بھی وہ اس راستے پر چل نکلا جہاں نہ انہیں کوئی منزل دکھائی دے رہی تھی اور نہ مجھے اس راستے پر رہبر کی رہنمائی ملی۔ دونوں چلتے چلتے آدھے راستے میں ہی بھٹک گئے تھے۔

اسی پریشانی میں، میں نے کئی راتیں گزاریں کبھی کبھی گھبراہٹ میں ایسا برا خیال دماغ میں آجاتا تھا میکے جا کر اپنی ماں سے سب کچھ کہوں۔ لیکن دکھ تو اس بات کا ہے کہ شوہر سے خفا ہونے کے واضح وجوہات معلوم نہیں۔ اور پھر سسر اور نند کے ساتھ کوئی برا برتاؤ بھی نہیں ہوا تھا۔ صرف اس گھر میں ایک انتشار کی سی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔

شام کی سرخی اندھیری رات میں تحلیل ہو چکی تھی ......دن بھر کی تھکن سے تو پوری رات آرام سے گزر جاتی ہے...... میری نیند تو آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی ......ایک میں ہوں کہ سوچوں سے ہی پیچھا نہ چھڑا پا رہی ہوں کچھ دیر تک اگرچہ میں بیڈ پر صرف کروٹیں بدلتی رہی۔ اٹھ کر کمرے کی کھڑکیوں کے پٹ کھول کر آسمان کی وسعتوں کو تک رہی تھی ...... چاند بھرپور انداز سے چمک رہا تھا۔لیکن چکور کا کوئی اتہ پتہ نہیں۔ چاند اور چکور کا ملنا حقیقت ہے افسانہ؟ ......کہیں یہ صرف کہانیوں تک ہی تو محدود نہیں؟ ......سچائی کیا ہے؟ ......اس عذاب کا سامنا تھا مجھے، پہلے تو اپنے شوہر کے ساتھ پُرخلوص محبت سے وقت گزرتا تھا......اب تو ان کے رویے سے بہت ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی...... بار بار گزری شاموں کی رعنائیوں کی کھوج میں تقدیر اور حالات نے دور کر دیا تھا......اپنی شکست پر آنسو بہانے لگی تھی کہ اچانک کمرے کے دروازہ پر دستک ہوئی اور میرے شوہر اندر داخل ہوتے ہی بیڈ پر لیٹ گئے مجھ سے کچھ کہے بنا ہی

میں خود شوہر کے پاس کھڑی ہو کر بولی...... چلئے اٹھئے مجھے گھر تک چھوڑ کر آیئے۔کب تک ماں کا لاڈلا خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتا رہے اور لاچار بے بس عورت محرومیوں کی سولی پر لٹکتی رہے؟......

سزا دینی ہے تو بے رخی سے کیوں......؟

نظروں کے سامنے بھی عورت قربان ہو جاتی ہے......اس سے پہلے

کہ میں کچھ اور بولتی وہ کمرہ چھوڑ کر چلے گئے انہوں نے اتنا نہیں سوچا میرے دل پر کیا بیتے گی میں داخلی دروازے کے نزدیک کھڑی ہو گئی...... اور پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی......اور خود کے آنسو پونچھ ڈالے......اب جو مان ہی ٹوٹ گیا کون کس کو مناتا......رہی سہی امیدیں دم توڑ گئیں......

اس سے پہلے کہ وہ رات بھر ادھر ادھر بھٹکتے ؟......میں نند رضیہ کے کمرے میں جا کر بے تحاشہ رو پڑی......وہ حیرت زدہ ہو گئی......اور اپنے دامن سے میرے آنسو پونچھ ڈالے رضیہ نے حالات سے سمجھوتہ کرنے کی بہت ضد کی۔ ان کے لہجے میں انور کا ملال ذہن میں چوٹ بن کر پڑ رہا تھا......

"تمہارا شوہر انور بہت حساس ہے......کسی سے بچھڑ کر کس طرح رہا جائے اس کا احساس ہو گا تو ضرور اس کو"......رضیہ بولی۔

جہاں اعتماد یا اعتبار نہ ہو وہاں ایک لاچار عورت کیا کر سکتی ہے...... جب وہ اپنے گھر سے نکلتی ہے......پھر دوسرے انجانے گھر میں پناہ لینے آتی ہے......جذباتی وابستگی سے وہ گھر آباد کرتی ہے......لیکن مجبوری کا زہر پی لینا یا پلا دینا راست قدم نہیں ہے......اس پشیمانی کی شکار تو ساسوماں کے سامنے بھی ہوئی۔ بار بار میرے کھانا بنانے میں نقص نکالتی رہتی ہے......اگر اپنے شوہر سے شکست خوردہ نہ ہوتی تو ایسی نوبت کبھی نہیں آتی......اس طرح اور زیادہ پس و پیش ہونے لگی تھی......کب تک دوراہے پر کھڑی رہوں

گی......اس تذبذب میں سوچتی ہوں اگر خدانخواستہ شوہر نے غلط راستہ اختیار کیا اور گھر سے مجھے بے دخل کر دیا تو مجھے سر چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی......عورت ذات ہی ایسی ہے کہ اس حالت میں وہ بالکل ٹوٹ جاتی ہے۔ اور حوصلہ کھو دیتی ہے...... کوئی اس انجام سے ڈرتی نہیں تو کوئی مرتی ہے......

رضیہ یہ سب سن کر خاموش ہو گئی تھی...... کچھ کہنے سے قاصر رہی تھی......میں نے محسوس کیا میری باتوں سے وہ ذہنی خلفشار کی شکار ہو گئی تھی......اور اسی اضطراب اور بے چینی میں رات کٹ گئی......

سب کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔......ناشتہ بالکل سامنے تیار تھا......سب کھانے لگے۔

''ممی! دیکھ تو آج مرچی، نمک صحیح ہے کہ نہیں......آج کھانا میرا بنایا ہوا ہے'' ......رضیہ ممی کو چڑاتے ہوئے بولی......

سب ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ آخر کس غرض سے وہ بولی......میں بھی حیران رہ گئی...... کہیں کسی کی عزت نیلام تو نہیں ہونے والی ہے......

''میں کسی بے چارے غنڈے بھائی کو زخم نہیں دینا چاہتی ہوں جس نے معصوم بیوی پر ان گنت اتنہ یا چار کیے......'' رضیہ بے باک ہو کر بولی......

''یہ سن کر میرے سسر اقبال صاحب نے اپنے بیٹے انور کو اپنائیت کا احساس دلا کر گلے لگالیا......اور سب کے سامنے انور کی کمزوری کو نہیں چھپایا......جس وجہ سے میاں بیوی دونوں خلفشار کے شکار ہو گئے ہیں......''ڈاکٹروں سے مشورہ کرنے کے بعد پتہ چلا کہ میرا بیٹا کبھی باپ نہیں بن سکتا ہے......میرے سسر اقبال صاحب۔''......معذرت خواہانہ لہجے میں بول پڑے'' انور شرمندگی سے خاموش تھا اور اس کی آنکھیں جھکی جارہی تھیں......سب لوگ میرے ردِعمل کے منتظر تھے۔ میں نے انور کی طرف دیکھ کر کہنا شروع کر دیا۔''عورت کبھی بے وفا نہیں ہو سکتی ہے۔ ماں نہ سہی بیوی تو تمہاری ہوں......خدا کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں'' ......سب کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی......



ماں

بیاہی ہونے کے بعد عورت کی چاہت اولاد کی ہوتی ہے......تبھی اس کو ماں کا درجہ ملتا ہے......جب وہ ماں بن جاتی ہے......اولاد کی خاطر دنیا کی عیش وعشرتوں کو تیاگ دیتی ہے......اور اپنا خون نچوڑ کر اسے پالتی پوستی ہے......اس کو پالنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھ چھوڑتی ہے۔

جب میں ماں کی امید بار آور بالاتر ہوگئی تھی طرح طرح کے خیالوں نے مجھے گھیر لیا تھا......ماں کا درجہ تو بہت اونچا ہوتا ہے......لیکن نہ جانے میں بے بسی کی تصویر کیوں بن گئی تھی......اپنے شوہر سے ملنے کے لیے بے تاب تھی...... یہ کیسا ظلم اور ستمگری تھی حالاتوں نے اسے قید کر رکھا تھا......میرے زخمی وجود کو ڈھارس بندھانے کے لیے وہ بھی بے چین ہوں گے......اضطرابی کیفیت کے ساتھ دن رات کاٹتی رہی......روز خدا سے التجا کر رہی تھی کہ میری پہلی اولاد لڑکی ہو اکثر لڑکیاں ماں کی مجبوریاں سمجھ کر مطمئن کر دیتی ہیں اور ماں کا حوصلہ بڑھاتی ہیں جب وہ پریشانی میں رہتی ہیں...... جو عورتیں کسی بھی جنس کا احترام کرتی ہیں ان سے خدا بھی خوش ہوتا ہے......لیکن اکثر عورتیں لڑکوں کی خواہش کرتی ہیں......وہ یہ بھول جاتی ہیں کہ لڑکی جننے سے ماں کی روح مطمئن ہو جاتی ہے دونوں جنس جننے سے تو

ماں کائنات کی بیٹی لگتی ہے۔ ایسا تو نہیں کہ میں سسرال کے خوابوں کی امیدوں پر پانی پھیر کر لڑکی جننے کی تمنا کرتی رہوں گی۔ یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے...... سوچا خدا کو جو منظور ہو گا۔ مقدر پر شاکر ہو جاؤں...... مقدر میں سب کچھ لکھا ہوتا ہے۔ اُسے کوئی نہیں ٹال سکتا ہے......

اکثر عورتیں پہلے بچے کو جنم دینے کے لیے سسرال سے میکے چلی جاتی ہیں...... اس واسطے ساسوماں نے بھی میری رخصتی کے لیے آمادگی ظاہر کی تھی...... میں نے اس لیے منع کیا کہ شوہر کے بغیر میں کہیں نہیں جاسکتی۔ ہوسکتا ہے وہ کبھی بھی گھر آجائیں...... اس لیے دروازے کی چوکھٹ پر میں ان کا انتظار کر رہی تھی...... دروازے پر آہٹ سنتے سنتے میں پاگل ہوگئی تھی ہر آہٹ پر پیٹ میں پلنے والے بچے کی چیخ سنائی دے رہی تھی۔ رورو کے میرا برا حال ہو رہا تھا......

اس حال میں نہ دن کا چین نہ رات کا آرام...... برے برے خیالوں نے سکون چھین لیا تھا...... کسی طریقے سے گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانا چاہتی تھی۔ ساسوماں بالکل منع کر گئی تھی...... پھر بھی ہلکے پھلکے کام میں مصروف رہتی تھی...... اس لیے کہ سستی نہ آجائے۔

اب تو دعاؤں کے ساتھ سنبھل سنبھل کے چل رہی تھی، کسی بھی طریقے سے سب کے ساتھ مل جل کر دن تو کٹ ہی جاتا تھا...... لیکن رات کی تاریکی میں بہت ڈر لگتا تھا...... ہر رات دریچے کے پٹ کھول کر دیکھ رہی تھی

کہیں شوہر کے قدموں کی آہٹ تو سنائی نہیں دے گی۔ کتنی خوش نصیب ہیں وہ عورتیں جو اس حالت میں بھی سرشار ہوں گی...... محبت نہ ہو تو تشنگیوں کے خلاء بڑھ جاتے ہیں...... مجھے تو انہوں نے پوری طرح مار دیا تھا......شوہر کے بغیر بچے کو جننے کی تمنا ایک دکھ کے سوا کیا ہے۔ یہی خوف سارے وجود میں سرایت کر گیا تھا......

کئی راتیں اسی طرح گزر گئیں...... ہر رات کسی کی آہٹ سن کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں......

شکر ہے کئی راتوں کے بعد نیند کی آغوش میں چلی گئی تھی...... اچانک میں نے بچاؤ، بچاؤ کی آوازیں واضح طور سنی تھیں...... میری آنکھ کھل گئی......اور آہستہ آہستہ بیڈ سے اٹھ کر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ ہر طرف مکمل سناٹا تھا۔ اس وقت اس کو حادثاتی واقعہ سمجھ کر نظر انداز کیا تھا۔

آدھی رات سے زیادہ وقت گزر چکا تھا جی چاہتا تھا ساسوماں کے پاس جا کر دلجوئی کرتی اگرچہ ان کی طرف قدم آگے بڑھنے لگے تھے۔ ایک دم سے میرے قدم رک گئے......

ساسوماں تہجد کی نماز پڑھ رہی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر دعائیں مانگنے لگی تھی۔ میں عقیدت بھری نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی اصل میں ان کا ذہنی تناؤ اپنے بیٹے میرے شوہر اور میرے بچے کی امید پر ہی تھا......

کچھ دیر بعد ساسوماں اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تھی......وہ

نڈھال ہی ہوگئی تھی......اور دیوار کا سہارا لینے لگی تھی...... میں نے جلدی ان کو سنبھال لیا......

ایک لمحے تک دونوں کی آنکھوں میں حیرت ابھری مجھے دیکھ کر وہ ششدر سی رہ گئی تھی۔

''تم ابھی تک سوئی نہیں......'' وہ اطمنان سے بولی۔

میں نے ٹال مٹول سے کام لیا......

لیکن وہ میری بے چینی بھانپ چکی تھی......

''تم اکیلی مت سویا کرو۔ جاؤ اپنی نند شائستہ کے پاس سو جاؤ'' ......وہ تاکید سے کہہ گئی تھی...... میں نے ہاں کہہ دیا تھا...... لیکن ابھی تک اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ جب تک کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر آرام سے بیٹھ گئی......

اس سے پہلے کہ میں اپنی نند شائستہ کے پاس چلی جاتی وہ جاگ چکی تھی۔ اور بالکل اپنے کمرے کے دروازے کے سہارے کھڑی سب کچھ سن رہی تھی......وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی میری طرف اور کبھی ماں کی طرف تک رہی تھی......ہم دونوں آپس میں لپٹ گئے تھے......اور میں بے تحاشہ رو پڑی......

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں اور بھی بھاری بھر کم ہونے لگی تھی اور میرا ڈلیوری کا وقت قریب تر ہونے گا تھا......

ساسوماں کے کہنے پر میں نے بالکل اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا...... ہر طرح کا غم یکسر مسترد کر کے ایک نئی خوشحال زندگی شروع کی...... کہ کہیں پیٹ میں پلنے والے بچے پر برا اثر نہ پڑ جائے، اپنے اندر سے اٹھنے والے طوفان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لیے دعاؤں سے بے چینی دور کرنے لگی......

دھیرے دھیرے وقت بیت رہا تھا......ایک دن حسب معمول ہم سب اکٹھے بیٹھے تھے۔ میرے سسر افضل صاحب بڑے اعتماد کے ساتھ خاصے خوشگوار موڈ میں تھے......انہوں نے اچانک مجھ سے سوال کیا......

''کیا یہ گھر بس جائے گا''؟......اس نے بلاتوقف کہہ دیا......اور جواب کے منتظر رہے......

میرا دل اندر ہی اندر دہل رہا تھا......کچھ کہنے سے اگر چہ قاصر رہی تھی......لیکن بہت جلد ہمت کر کے بول پڑی تھی......جب فیصلوں کا حق دماغ کے پاس ہو تو دل آزاری کا سوال ہی کہاں پیدا ہو جاتا ہے......اب تو اسی گھر کی ہو چکی ہوں......اور ایک بات کہنا چاہتی ہوں......

''کہو، ہاں ہاں، کیوں نہیں ضرور کہو''......

میں یہاں صرف بچی باپ کے حوالہ کرنا چاہتی ہوں۔ شاید میں زندہ رہوں یا نہ رہوں......

اتنے میں فون کی آواز آئی......

فون کیا تھا۔ ایک دھماکہ تھا، ایک قیامت تھی، ایک زلزلہ تھا۔ جو اس گھر میں آیا تھا......

میرے سسر فون پکڑے ہوئے بہت زیادہ کانپ رہے تھے...... اضطرابی لہر اس کے وجود کو جھنجھوڑ چکی تھی...... وہ کچھ کہنے سے ڈر رہے تھے......لیکن اس سے پہلے کہ یہ گھر طوفان کی لپیٹ میں آجاتا

''میرے بیٹے یعنی تمہارے شوہر کو یہاں سے شفٹ کر کے باہر بڑے جیل خانہ میں پہنچا دیا گیا ہے''......منہ سے نکلی ہوئی بات کو وہ روک نہ سکے......اس بات سے سب حیران ہو گئے...... یہ کوئی چور، ڈاکو یا قاتل تو نہیں......اپنے وطن کی آزادی کے لیے جنگ لڑ رہے تھے۔

اس بار میں نے محسوس کیا......اپنے آپ میں ہمت جٹائی......ایک احساس پورا جیون بدل ڈالتا ہے......جس راستہ پر جانے کے لیے تیار تھی امید کو یقین بنا کر اپنے آپ کو حوالہ کر دیا تھا......لیکن کسی خدشے نے خوف زدہ کیا تھا......جانے کون سی مجبوری نے میرے قدموں میں زنجیریں ڈال دیں۔ وہ ہے میرے بطن میں بچے کی زندگی۔

''تم نے جو سنا غلط تو نہیں سنا''......ساسوماں اپنے خاوند سے بول رہی تھی......''

اس سے پہلے کہ وہ ہم سے کچھ بولتے۔ انہیں جانے کی بہت جلدی تھی......ان کے چہرے سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہے ہے

تھے...... سننے اور دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ وہ بہت زیادہ تذبذب کے شکار ہوکر چلے گئے......

یہ دیکھ کر میں بے حد خاموش اور افسردہ ہوگئی تھی۔ صرف چند لمحے گزرنے کے بعد میرے پیٹ میں ایک طوفان سا درد اٹھنے لگا تھا۔ جو برداشت سے بالکل باہر تھا...... اپنی حالت پر اختیار ہی نہیں رہا تھا۔ اپنے سے بے قابو ہوگئی تھی......

مجھے فوراً ہسپتال پہنچایا گیا تھا...... وہاں سننے میں آیا میرے شوہر کو دوسرے جیل خانے میں شفٹ نہیں کیا گیا تھا بلکہ اُسے سخت قسم کا ٹارچر کیا گیا تھا۔ وہ خون میں لت پت تھے...... اسی ہسپتال میں ایڈمٹ کر دیا گیا تھا اس وقت اگرچہ میں نے ایک پھول سی بچی کو جنم دیا تھا لیکن میرے شوہر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔



اندھیرا اُجالا

میری بیٹی رضیہ کی زندگی ایک خوبصورت ترین دور سے گزر رہی.......... جب وہ کلی سے پھول کے مانند خوشبو پھیلاتی نظر آ رہی

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی ماں باپ کے ساتھ پیار بھرا لمس ہمارے درمیان کے فاصلے حائل کر دے بچپن کی کتاب زندگی کے گزرے باب کو بند ہوتے دیکھ کر دل میں ایک خلش ایک چھبن کا احساس ہونے لگا......شادی کی دور کی بات گھر میں دو وقت کی روٹی کے لئے کتنی پریشانیاں اور تکلیفیں اٹھانے پڑ رہی میرے شوہر تو مشکل سے مہینے کی کمائی کر لیتے اور پھر رضیہ کے علاوہ دو اور چھوٹے بچے۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا اسی روزگاری میں پل رہے اپنی اس بے بسی پر وحشت ہونے لگی تھی......اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں خدا سے دعا کرتی ہوں سب صحیح سلامت رہے۔

اس مشکل وقت میں اگرچہ رضیہ نے بی، اے تک تعلیم حاصل کر لی۔ گھر کی حالت کو دیکھ کر تعلیم چھوڑنا پڑی اس مفلسی کے بدولت میری طبیعت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی اور کبھی کبھی اس بیمار دل نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا......

نہ کوئی راستہ ہی ہموار دکھائی دے رہا اور نہ کوئی منزل صاف نظر

آ رہی...... رضیہ گھر کے کام کاج میں ہی لگ گئی...... بچوں کی عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ فکریں اور زیادہ بڑھنے لگی...... اپنی نگرانی میں جیسے کانچ کی گڑیوں کی طرح سنبھال کے رکھے کہیں ٹوٹ کے بکھر نہ جائے۔ ان بچوں کو خود اعتمادی سے اپنے ساتھ خوشحالی میں جوڑنے کی کوشش کر رہی......

ایک دن اچانک میرے گھر کے چوکھٹ پر کوئی دستک دے رہا تھا...... دروازہ کھولتے ہی ایک انجان مرد اور عورت کو دیکھ کر حیران ہوگئی

''السلام علیکم''......

''وعلیکم السلام''......

''کیا اندر آنے کی اجازت ہے...... وہ عورت اطمینان سے بولی

ہاں۔ ہاں۔ میں صبری سے بولی......

وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی میرے ساتھ بیٹھ گئے......

ان کی بے تکلفی کی مسکراہٹ سے صاف پتہ چلتا ہے کہیں وہ میرے شوہر کے جانے پہچانے تو نہیں ہے...... جن کو میں جانتی نہیں تھی...... لیکن اس عورت کا جانا پہچانا چہرہ کچھ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا...... کہیں دیکھا تھا۔

باتوں باتوں میں وہ میری بیٹی رضیہ کو اپنے بیٹے کے ساتھ رشتہ جوڑنے کے لئے بڑے اطمینان سے بول پڑی...... ایک لمحہ فکر یہ نے مجھے گھیر کر رکھ دیا...... اگر چہ انہوں نے میرے دل و دماغ کے چراغ روشن

کر دئے۔لیکن زبان پر مجھے مہر لگ گئی اتنی جلدی میں ہاں بھی نہیں کر سکتی......اس لئے کہ جس کشتی پر ہم سوار تھے وہ بغیر پتوار کی کشتی تھی......منزل کا کوئی اتہ پتہ نہیں......کچھ دیر تک میں یوں ہی تماشائی بنی بیٹھی رہی......انہیں کافی دیر یہاں بیٹھے مجھے احساس ہو رہا تھا......

اس سوچ سے باہر نکلتے ہی میں نے چائے بنانے میں دیر نہیں کی......اور نہوں نے پینے سے بھی انکار نہیں کیا......

''آپ کچھ بولتی کیوں نہیں......اس طرح اجنبیوں کو دیکھ کر حیران ہو گئی ہو......کبھی کبھی حالات اس طرح کروٹ لیتے ہیں انسان سوچ بھی نہیں سکتا......میں بھی ایک ماں ہوں میرا نام رفیقہ ہے......مقدر پر شاکر ہونا چاہیے......لڑکیوں کا مقدر محرومیوں سے ہی ملتا ہے''

وہ بڑے اطمینان سے بولی جا رہی تھی......''

بات کرنے سے مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی......لیکن شکست خوردہ سی مسکراہٹ میرے لبوں پر دوڑ گئی......کچھ دیر تک بیٹھے بٹھائے وہ یہاں سے چلے گئے......اور مجھے ناسمجھنے والی بات پر حیران کر دیا......ظاہر سی بات ہے ہمارے نصیب میں یہ بہت دور کی بات لیکن جیسے وہ مطمئن ہو کر نکلے......

سوچو تو نہ تن میں مخملی لباس، نہ سونے چاندی کا بناؤ سنگار صرف غریبی اور لاچارگی کی تن کو چھپانے کے لئے ایک چادر۔

اگرچہ بیٹی رضیہ کی قسمت کی لکیریں تاریکی کالے بادلوں میں امید کی ایک کرن نظر آنے لگی...... لیکن چاند کو جلوہ گر ہونے کے لئے بادلوں کی اوڑھ سے نکلنا پڑے گا...... جو بادل ہماری لاچارگی ہر منڈلا رہے ہے...... شادی کوئی گڑیا کا کھیل نہیں...... کتنے کٹھن راستوں سے گزرنا پڑتا ہے...... ہر موڑ پر طرح طرح کی روکاوٹیں کھڑی ہو جاتی ہے...... ایک دلہن کو سجانے سنوارنے اور پھر وداعی تک کتنے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے...... یہ تو بالکل ہمارے لئے ناممکن سی بات......

سوچتی ہوں یہ غریبی اور مفلسی کا لبادہ اوڑھ کر ہم کتنے دیر تک رضیہ بیٹی کو گھر میں رکھیں گے...... گرچہ اس وقت ان کی قسمت مہربان ہوگئی...... اب تو اس کی زندگی میں خوشی بھرنے کے لئے فیصلہ کرنا باقی تھا...... راستہ کوئی بھی ہموار دکھائی نہیں دے رہا تھا......

سوچتے سوچتے وقت کچھ اور آگے بڑھا۔ کبھی اپنی بیٹی رضیہ پر میری نظر پڑتی تھی۔ جیسے ایک لطیف سا حجاب پھیل کر چہرہ ایک نئی نویلی دلہن کے مانند۔ آنکھوں میں چمک۔ حیا جیسی خوشبو، جوانی کا الہڑپن جب ان خوابوں سے بیدار ہو جاتی ہوں...... ایسا ڈر ہونے لگتا ہے کئی اسکی گنہگار تو نہیں بنتی جا رہی ہوں۔

سوچوں سے دامن چھڑا کر ایک دن میں نے اپنی بیٹی رضیہ کو اس شادی کے بارے میں بتا دیا...... وہ چونک سی گئی...... چند لمحوں تک خاموشی

توڑ کر وہ صاف طور سے انکار کر گئی......

شادی کرنے سے انکار کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی......اپنے گھر کی حالت دیکھ کر اور پھر میری بیماری جو روز بہ روز ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی......ابھی اس لڑکی میں خود اعتمادی موجود ہے......بچپن سے لے کر آج تک اسی اعتماد اور خلوص سے جی رہی ہے۔ ہزاروں غم اور فکریں وہ اپنے سینے میں دبا کے رکھیں ہیں......وہ حوصلے سے مجھ سے بھی دو قدم آگے بڑھتی رہی ہے۔

اس بات سے انکار نہیں جوانی کی دہلیز پر پہنچ کر اکثر لڑکیاں شادی کی رضامندی ظاہر کرنے کے لئے کوئی بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے......شادی کا نام سنتے ہی ایسی لڑکیوں کو اپنی جوانی کی قدرو قیمت کا احساس ہونے لگتا ہے اور وہ بالکل شادی کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔لیکن میری بیٹی رضیہ نے مجھے اس بدگمانی سے باہر نکالا اصل میں جو رشتہ رضیہ کے ساتھ جوڑنے آئے تھے......رضیہ ان کو اچھی طرح سے جانتی تھی۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے۔ مشکل سے ایک دو مہینے گزر گئے ہوں گے......میں ہسپتال میں ایڈمٹ تھی۔ ہمارے بیڈ سے چند فاصلے پر ایک عورت درد سے کراہ رہی تھی۔شاید اس وقت اس کے پاس کوئی خدمت گار موجود نہیں تھا......وہ چہرہ چھپا کر رو رہی تھی......تب رضیہ اس کو سنبھالنے گئی تھی......ان کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنی آنچل سے پونچھ ڈالنے کی

کوشش کر رہی تھی ...... اُن کی بے ترتیب پہنے ہوئے کپڑوں کو بھی درست کر رہی تھی ...... یہ سلسلہ تب تک جاری تھا۔ جب تک مجھے ہسپتال سے چھٹی مل گئی تھی ......

یہ میری بیٹی کا بڑا اپن تھا نہ کہ وہ اُن سے کوئی صلہ مانگ رہی تھی ...... انہوں نے خود میری بیٹی کا ہاتھ مانگا۔ جو بالکل ناممکن سی بات تھی۔

رضیہ نے مجھے اُن کے بارے میں یہ بھی بتا دیا کہ وہ امیر گھرانے سے تعلق رکھتے ...... سوچا اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانے کی جہ سے پریشانی کا سامان خود پیدا کرنا ہے۔

یہ اپنی بیٹی رضیہ کی شخصیت اور خوبیاں اپنی لاچارگی کی وجہ سے بھاری پڑ رہی ...... ایک بیٹی کو تو شادی کے بندھن سے باندھنا ہی پڑتا ہے ...... کس قدر یہ مایوسی ہو رہی ...... ہمارے لئے یہ خواب ہی سہی لیکن آنے والا وقت کیا کچھ دکھا کر جائے گا۔ کچھ علم نہیں ......

لگتا ہے میری بیٹی رضیہ کو انہوں نے تہہ دل سے پسند کیا ...... تب ہی انہوں نے دوسری دفعہ آنے میں دیر نہیں کی تھی ...... اس دن رفیقہ اکیلی آئی باتوں باتوں میں میری سرد مہری کا احساس انہیں ضرور لگا ہوگا ...... برعکس اس نے میرے مردہ جسم زندگی کی حرارت بیدار کر کے جرأت دی ......

زندگی کو زندگی کی طرح گزارنے کی صلاح دی ...... میں نے وہ پردہ ہٹا دیا اس کے سامنے جس پردے کے پیچھے میری غریبی اور لاچارگی،

مفلسی چھپی تھی......اس لئے کہ شاید وہ اس بارے میں سوچنے پر مجبور ہوجائے گی لیکن اس نے فوراً اپنی امیری کا لبادہ اتار کر زندگی کی اصل حقیقت کو سامنے رکھ کر مشورہ دیا کہ سب اپنی اپنی قسمت سے جی رہے ہیں۔ یہ قسمت کا کھیل وہی جانے جس کے پیچھے سب دوڑ رہے ہیں......امیر ہو یا غریب۔ میں تو صرف یہ جانتی ہوں جس گھر میں ایک بیٹی نہ ہو وہ گھر کبھی امیر نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لئے آج میں آپ سے ایک بیٹی کا ہاتھ مانگنے آئی ہوں......

میری بیٹی رضیہ کی جدائی کا غم شاید اُسے دکھائی نہیں دے رہا تھا...... میں نے جیسے خود اس کے سامنے ہتھیار ڈالے اس لئے کہ بیٹی آخر کار اپنے گھر سے وداعی لیتی ہے......میں اپنے آپ سے شکست کھائی......ہجر کی کیفیت کا احساس تو ہے......لیکن تقدیر سے بھلا کون لڑسکتا ہے......

پیسوں کے متعلق میں بہت زیادہ فکرمند ہوگئی تھی۔ اپنی پشیمانی پر انتہائی شرمندگی کی لہر دوڑ گئی......اس کے سامنے کچھ کہنے سے قاصر ہوگئی......

''آپ کچھ بولتی کیوں نہیں...... خاموش کیوں ہوگئی۔ میں سونے چاند کے بدلے گھر کی خوشی کے لئے ایک مکمل چادر سے لپٹی ہوئی بیٹی کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں......'' رفیقہ جذبات انداز میں بولی......

وہ تو اپنے اندھیرے گھر کو روشنی کی ایک کرن کو ترس رہی تھی۔ اور

میرے ہونٹوں سے ''ہاں'' سننے کے لئے ترس رہی......اس بات سے حیرانگی ہوئی میرے شوہر میرے پیچھے کھڑے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ سب کچھ سُن رہا تھا گرچہ وہ بھی اس غم میں نڈھال ہو رہے تھے...... مجھے تسلی تشفی دے کر اس خوشی میں ہمکنار کر دیا......میرے دل کا بوجھ تو کچھ دیر کے لئے ہلکا ہو گیا۔ دیکھا تو رفیقہ کو جاتے ہوئے اس کے چہرے پر اطمینان کی مسکراہٹ پھیل گئی......اور میں سوچنے پر مجبور ہوگئی۔ یہ گھر کا اندھیرا ہے یا اُجالا......



ایک گاؤں کی کہانی

شہر سے زیادہ دور نہیں ایک گاؤں بہت ہی خوبصورت ہر طرح کی خوشحالی سے مانوس تھا۔ کھیتوں کی ہریالی باغ باغیچے، پیڑ پودے اپنے پُرفضا ماحول کو اور دوبالا کرنے میں لہلاتے نظر آرہے تھے......لوگ جفاکش محنتی اور ایک دوسرے کے کام میں جٹ جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے تھے......گویا کہ یہ گاؤں جسے اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت سے مالا مال کر دیا تھا......

زندگی کی جدوجہد میں کسی ٹکراؤ کے بغیر کامیابی اگر ملتی ہے ایک جٹ ہو کر ہو کر مرد عورتیں شامل ہونے کی صورت میں ہوتی ہے......

وقت کا انتظار کئے بغیر بدلتے موسموں کے اعتبار سے بہار ہو یا خزان کسی بھی موسم میں اس گاؤں میں لوگ مقرر وقت پر انجام تک پہنچانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں......

ویسے اکثر دیہاتی لوگ مرد عورتیں ایک جٹ ہو کر کھیتی باڑی کرنے میں لگ جاتے ہیں......دیکھا جائے تو مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ کاموں میں مصروف رہتی نظر آرہی ہیں......مال مویشی پالنا، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانا، کھانا بنانے کا بوجھ، اولادوں کو جینا اور اُن کو پالنا سب عورت کے حصے میں شاید بہت زیادتی ہیں......

مرد تو اپنی مردانگی کے جنون میں عورت کی نسبت اپنے آپ کو اونچا درجہ دینے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتا۔ اس تلخ دہ حقیقت میں وہ اپنی حصہ داری کو سمجھ کر ٹال دیتا ہے...... کبھی کبھی عورت کی کمزوری انہیں ذہنی خلفشاری کا شکار کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے...... بہر حال عورت تو ہر حال میں اپنے گھر کو سنوارتی سجاتی ہے......اور کھیتوں میں گیتوں کے سُر میں اپنی مسکراتے ہونٹوں سے اپنے ارمان جگاتے ہیں...... کھیتوں میں پلنے والے ہر گوشے پر جان نچھاور کرتے ہیں......جن امیدوں سے وہ سارا کام انجام دیتے ہیں......وہ قابل تحسین ہے......

مقدر کی سختیوں سے بھی کبھی کبھی گزرنا پڑتا ہے۔ تکلیف دہ موسم بھی کبھی دامن تھام لیتا ہے...... پھر بھی وہ جن امیدوں سے جی رہے......آنے والے وقت کی طرف خواہ کتنی بھی سختی ہو ہر کوئی مرد ہو یا عورت کام میں لگے رہتے ہیں۔

اس گاؤں میں عبدالسلام دوسرے لوگوں کی نسبت ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے......اس کا اپنا ایک کردار تھا......سب کے ساتھ مل جل کر شانہ بشانہ دکھ اور سکھ میں کسی کام کو انجام دینے میں کوئی ہچکچاہٹ ہونے نہیں دیتا...... اپنی بیوی نسیمہ اُن کی رہنمائی میں تھی......اس بات سے انکار نہیں کہ مرد کی کامیابی کے پیچھے عورت کا ہاتھ ضرور رہتا ہے اس کی بیوی نسیمہ پل پل اس کا ساتھ دیتی تھی......ان کے ہاں ایک بیٹا انور ایک ساجدہ

بیٹی دونوں جوان سال گھر کے کام کاج اور تعلیم حاصل کرنے کے لئے پیچھے نہیں تھے......

اکثر یہاں دیہاتی لوگ دیکھا دیکھی میں اپنے بچوں کو تعلم حاصل کرنے کے لئے کوئی کسر باقی نہیں رکھتے تھے......اس دیکھا دیکھی میں فائدہ تو ضرور ہوتا ہے کہ کسی کے کام کو دیکھ کر پیچھے نہیں مڑتے......لیکن کبھی یہ دیکھا دیکھی تو اپنے اوپر بھاری پڑ جاتا ہے۔کوئی غلط راستے پر چلتے چلتے بھٹک بھی سکتا ہے۔زمین پر اپنے قدموں کو اپنی ہی سمت کھینچنا اپنی سہانی تعبیر سامنے آجاتی ہے دوسروں کی نسبت سے جو صحیح راستہ کھوجاتے ہیں اور اپنے ہی دروازے بند کر دیتا ہے۔

عبدالسلام کے بیٹے انور نے جب شہر کے کالج میں داخلہ لیا تھا......

تو پڑوسی رمضان جو نے بھی اپنے بیٹے ارشد کو پڑھائی کے سلسلہ میں نہیں بلکہ شہر میں کام کرنے کے سلسلے بھیج کر اس دیکھا دیکھی میں اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری...... کیونکہ وہ رمضان جو کا اکلوتا بیٹا تھا۔جو اس کے کھیتی باڑی کے کام مین شانہ بشانہ تھا......بعض اوقات یہ پتہ نہیں چلتا جس راستے پر منزل کی تلاش ہوتی ہے کسی بدگمانی میں وہ صحیح راستہ کھوجاتا ہے اور بھٹک جاتا ہے......

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عبدالسلام کے بیٹے انور نے کالج تک ہی تعلیم مکمل کرلی......آگے وہ شہر میں ہی رہنے کی ضد کر رہا تھا......اُسے

بہت سارے پیسوں کی ضرورت تھی جو عبدالسلام نے تھوڑا زمین بیچ کر پوری کردی۔ یہ بات تو پورے گاؤں میں جنگل کیا آگ کی طرح پھیل گئی...... ہر کوئی یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ عبدالسلام نے صحیح کیا کہ یا غلط...... کسی کی خوشی کی خاطر اپنے ارمانوں کا خون کرنا خسارے سے کم نہیں......

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جو زمین کا ٹکڑا عبدالسلام نے اپنے بیٹے کی خوشی کے لئے بیچ ڈالا تھا۔ تب سے شہری لوگ اس گاؤں کی طرف رخ کرنے لگیں تھے......

اپنی ضرورت کی وجہ سے یہ شہری لوگ مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کی توسط سے ملنا شروع کیا تھا۔

گرچہ زمین کی خرید و فروخت یہ بات ناممکن سی تھی...... کیونکہ دیہاتی لوگ اپنی زمین کو اولادوں سے بھی زیادہ درجہ دیتے ہیں...... یہ ان کی زندگی کو پونجی جس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ہے......

فیصلوں کا حق دماغ کے پاس ہو تو دل آزار کا سوال ہی کہاں رہ جاتا ہے...... اس لئے یہ بات کسی وقت تک دب کے رہ گئی تھی...... اور سب گاؤں والے اپنی کھیتی باڑی میں لگ گئے تھے...... لیکن زمین خریدنے والوں کا دم خم نہیں ٹوٹا...... وہ کوئی اور بہانہ ڈھونڈنے کی کوشش میں تھے...... اسی اثنا میں جس شخص نے عبدالسلام سے کو زمین خریدی تھی وہ شہر کا ہی ایک بزنس مین تھا...... کچھ ہی مہینوں میں اس نے اس زمین کے ٹکڑے پر ایک شاندار کوٹھی

تیار کی۔ جسے اس گاؤں میں رونق سی آ گئی...... گاؤں والے اس کوٹھی کو دیکھ کر ہکے بکے رہ گئے تھے۔ دل میں ایک ہلچل سی پیدا ہوگئی...... دیکھا دیکھی میں ایک دوسرے سے سبقت لینے لگے...... اور خود کو اسی سانچے میں ڈال کر اپنے ارد گرد شعلے بھڑکاتی آگ کو ہوا دینے لگ گئے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب تو گاؤں والے اُن کے ساتھ مہمان نوازی کرنے لگے...... مہمان نوازی تو گاؤں والے خوش اسلوبی سے کرتے ہیں۔ خاص کر جب کوئی شہر سے آیا ہو......

ہر مراحل سے گزرتے وقت کے ساتھ۔ چند روپیوں کے عوض زمین بیچ ڈالنی شروع کی...... اب تو گاؤں والے جشن مناتے نظر آرہے تھے۔ جس طرح کھیتوں میں برسات ہونے کی صورت میں خوشی سے جھوم جاتے تھے آج روپیوں کی برسات ہو رہی تھی۔ آنے والے وقت کی پرواہ کیے بغیر...... اب نہ وہ کھیتوں کی ہریالی...... وہ باغ باغیچے وہ میوہ سے بھرے درخت...... وہ ٹھنڈی مٹی سے بنے ہوئے گھر...... نہ کھلی صحن میں چاند اور سورج کی کرنیں...... نہ طلوع آفتاب ہونے سے پہلے مرغ بانگ دیتا نظر آرہا تھا۔

چاروں طرف سے لوہے، اینٹوں، پتھروں سے یہ زمین جھلس رہی ہے...... یہ گاؤں تو اب اونچے اونچے دیوارں میں قید ہوا۔ نہ جانے یہاں بسنے والے دیہاتی کہاں کہاں بھٹک رہے ہیں......

یہ نہ شہر بنا ہے نہ گاؤں۔

Jeel Dal Ki Kahani Apni Z

PAYASI JEEL

Afsanou Ka Majmuwa

By

Majeed Arjamnd



Meezan Publishers & Distributors

Opp. Fire & Emergency Services HQRS Batamaloo

Srinagar Kashmir-190009

Ph/Fax:- 0194-2457215 | Cell: 9419002212 | 8494002212 7006773403

E-Mail: meezanpublishers@gmail.com | @rediffmail.com